ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اگست رستمبر ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	وہ جس کی خود خدائے پاک کرتا ہے نگہبانی	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	سیرت	پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں (قسط/۸)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم اے جمیل	۱۰
۴۔	// //	رسول اکرم کا داعیانہ کردار	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۲۱
۵۔	اسلامی تعلیمات	عظمت صحابہ	آدم علی ندوی	۱۸
۶۔	// //	بدعات وخرافات	مولانا کلیم اللہ عمری مدنی	۲۸
۷۔	// //	نکاح ایک عبادت	محمد شعیب ندوی	۳۳
۸۔	تعلیم و تربیت	میں مسلسل انکار کرتا رہا پھر اچانک.....	محمد الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی	۴۶
۹۔	نقطۂ نظر	دینی مدارس اور بیرونی ملکوں میں اردو زبان.....	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۵۰
۱۰۔	// //	فارغین مدارس کی موجودہ صورت حال	محمد انس فلاحی سنبھلی	۵۴
۱۱۔	تذکرہ	شیخ عزالدین القسام	پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں	۶۵
۱۲	زبان و ادب	''نقوش رفتگاں'' فکر وفن کے آئینہ میں	محمد قمر الزماں ندوی	۶۷
۱۳۔	اصلاح معاشرہ	موجودہ تہذیب میں اسلامی معاشرہ کی اہمیت	ابوسعد اعظمی	۷۳
۱۴۔		تعارف وتبصرہ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۷۵
۱۵۔	آخری صفحہ	عنقا را بلند است آشیانہ	م،ق،ن	۸۰

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

اسرائیل (مقبوضہ فلسطین) کی بربریت اور ہم:

رمضان کا مقدس مہینہ، رحمتوں کے نزول کا موسم، اہل غزہ کا روزہ اور اسی روزہ کی حالت میں ان کی سخت ترین آزمائش، لیکن سلام اہل غزہ کے پائے استقامت کو اور سلام فلسطین کے ان جیالوں کو جنہوں نے اپنی ایمانی طاقت کے سبب دشمنان خدا کو یہ باور کرادیا کہ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کہاں اسرائیل، اس کی طاقت، اور طاقت سے بڑھ کر طاقت کا نشہ، بے لگام شیطان، اور شیطان کے شیطانی وسائل اور اس پر مستزاد اس کے منافق دوستوں اور ہمنواؤں کی بھرپور مالی امداد اور کہاں غزہ کے نہتے اور کمزور عوام، بھوکے اور امراض کے شکار بچے، حصار میں رہ کر پلے بڑھے جوان لیکن سچ ہے ان تنصرو الله ينصركم ويثبت اقدامكم (ترجمہ: اگر اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا) (سورۃ محمد: ۷)۔ انہیں اپنے ایمان پر بھروسہ تھا، اپنے حق پر ہونے کا اعتماد تھا اسی لیے وہ اپنی مزاحمت میں پرعزم تھے، اللہ نے انہیں عزت دی، اسرائیل کو ظلم کی تمام حدیں پار کرنے کے بعد بھی مجبور ہوکر خود ہی جنگ بند کرنی پڑی، فلسطین کی تحریک مزاحمت نے اس کی شرطوں کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک کر یکے بعد دیگرے دو ہزار سے زائد جانوں کا نذرانہ دیا، لله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لا يعلمون، (ترجمہ: حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں، (سورۃ منافقون: ۸) گو کہ اب کہ بار یہ بھی ڈرامہ ہوا کہ اقوام متحدہ کی کونسل نے اسرائیل کے جنگی جرائم کی تحقیق کے لیے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے ایک کمیشن تشکیل دی، وہاں ہمارے وطن عزیز نے فلسطین کے حق میں ووٹ دیا گو کہ یہاں ایوان میں مذمتی قرارداد تک منظور کرنے سے گریز کیا، دونوں عمل میں کھلا تضاد ہے لیکن اہل نظر دونوں کے مضمرات سے بخوبی واقف ہیں، یہاں کسی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کچھ مقصد کی بات عرض کرنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اب تک ہم نے فلسطین کے لئے کیا کیا؟؟ فلسطینی بذاتِ خود تو جو کچھ کر سکتے تھے کیا اور کر رہے ہیں، اگر وہ چاہتے تو ان کی اکثریت عرصہ پہلے بڑی آسانی کے ساتھ سب فروخت کر کے کہیں ہجرت کر جاتی اور چین کی زندگی بسر کر رہی ہوتی، لیکن نہیں! وہ آج بھی تمام تر صعوبتوں کے ساتھ تیس تیس چالیس چالیس سالوں سے ایک ایک خیمہ

میں ایک ایک خاندان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، خیمہ بھی صرف پلاسٹک کی پالیتھن کا ہوتا ہے، اس ضمن میں شواہد اور واقعات کا ایک انبار ہے جس کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں، طرفہ یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ محض اپنی مصلحت پسندی یا بعض دیگر اسباب کے سبب ان ہی فلسطینیوں کو اسرائیلی بربریت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، یہ موقف ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو ایمانی بصیرت سے خالی، وقت کے غلام اور مفادات کے بندے ہوتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اب تک اسرائیل کو نکیل ڈالنے کا کام صرف ان ہی اللہ کے بندوں نے کیا ہے، پاگل کتوں کو قابو میں کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ زخم تو آتے ہیں اور جسم لہولہان تو ہوتا ہے لیکن بڑے خطرات کو ٹالنے کیلئے یہ سب کرنا پڑتا ہے، وہاں جب ماں بچہ جنتی ہے، تو اسے خوف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہے، اور اس کو کیا کرنا ہے، اسی لیے انہیں اپنے بچوں کی شہادت سے زیادہ افسوس اپنے مسلم پڑوسیوں کی سرد مہری پہ ہوتا ہے، وہ ماتم اپنے جانی و مالی نقصان پر نہیں بلکہ مسلم ممالک کے نفاق اور منافقانہ کردار پر کرتی ہیں، پہلے فلسطین کا عربوں نے سودا کیا جو سودا آخری ترک خلیفہ نے بڑی سختی سے مسترد کر دیا تھا، لیکن پھر یورپ و برطانیہ نے بات سمجھ لی، پہلے عربوں کو قومیت و وطنیت کے بت دیے، بغاوت پر آمادہ کیا پھر خلافت کی قبا چاک کی اور فلسطین کا سودا کیا، اب وہی عرب اسرائیل کو پٹرول کے ساتھ ساتھ مالی امداد بھی دیتے ہیں تا کہ وہ خطہ میں اپنے پیر جما سکے اور ہر اس اسلام پسند کی گردن کاٹ سکے جس کی اسلام پسندی سے موروثی اور عیش پرست تقلید مغرب کو خطرہ ہو، ایسا وہ اپنے آقا امریکہ کے حکم پر کرتے ہوں، یا اپنی بزدلی کے سبب کرتے ہوں یا اسرائیل کا خوف ان پر مسلط ہو، یا ایران سے بڑھ کر وہ امریکہ و اسرائیل کے دوست بننا چاہتے ہوں یا محض اپنی ذاتی حکومتوں کی حفاظت مقصد ہو، سبب کچھ بھی ہو یہ صاف ہو گیا کہ اب عرب حکام خدا سے زیادہ امریکہ و اسرائیل پر یقین رکھتے ہیں اور اسی سے خائف رہتے ہیں، یہود و نصاریٰ کی یہ دوستی اور حد سے بڑھا یہ باہمی تعاون معلوم نہیں قرآن و حدیث کی کس نص سے درست قرار پاتا ہے جس باہمی تعاون کی بنیاد ہی اسلام دشمنی ہے کہنے والوں نے صحیح کہا ہے کہ صہیونیت کی تشکیل و تحفظ اور تحریک میں نصف حصہ عربوں کا ہے بلکہ صہیونی تحریک کی اسلام دشمنی میں اب عرب حکمراں پورے طور پر شریک ہو گئے ہیں، اسلام دشمنی میں سیکولرزم یا جمہوریت کے نام پر وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی بابت بس یہی کہا جا سکتا ہے، انھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے میں ہیں) (سورۃ حج: ۴۶) رہی بات ایران کے مقابلہ میں عرب ممالک کی اپنے استحکام کے لئے امریکہ و اسرائیل دوستی کی تو حقائق کی دنیا میں یہ واضح ہے کہ ایران کا عالمی طاقتوں سے جو رشتہ ہے وہ کبھی کسی عرب ملک کا ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ تاریخ کے ہر دور میں یہ رشتے استوار رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عربوں کو ہمیشہ ایران سے خائف کیا گیا اور اس بہانے ان کی دولت بھی لی گئی، انہیں غلام بھی بنایا گیا اور ایران کو مکمل مستحکم ہونے کا موقع دیا گیا۔

فلسطین کے لئے جو حکومت اور جو تحریک سب کچھ کر سکتی تھی وہ صرف ''الاخوان المسلمون'' تھی، ماضی میں بھی

اس نے یہ ثابت کیا، جب اس کے جانباز تل ابیب میں داخل ہونے والے تھے تو مصری صدر نے اپنی ایمان فروشی کے باعث فوجوں کو واپس بلالیا، اخوانی مجاہدوں نے کہا کہ ایک دو روز میں ہم تل ابیب فتح کریں گے اب بات چیت سے حل تلاش کرنے کا کیا مطلب؟؟ تو انہیں اس قدر مجبور کیا گیا اور دھمکیاں دی گئیں کہ وہ اس رسوائی کو زہر کا پیالہ سمجھ کر پینے پر مجبور ہو گئے، ۲۰۱۱ء میں جب اسرائیل نے سرکشی کی تو محمد مرسی نے اسرائیل کو پسپا ہونے اور جنگ بند کرنے پر مجبور کر دیا، ابھی حالیہ اسرائیلی دہشت گردی کے دوران واشنگٹن پوسٹ نے یہ کھلا اعتراف کیا کہ ''اسرائیل کو اگر کوئی شخص لگام دے سکتا تھا اور جنگ بندی پر مجبور کر سکتا تھا تو وہ صرف اخوانی صدر محمد مرسی تھے'' رہی بات دیگر اسلامی ممالک کی تو وہ صرف فلسطینیوں کو زکوۃ وصدقات دے سکتے ہیں، زخمیوں کا علاج کر سکتے ہیں، خیراتی فنڈ سے کچھ تعمیراتی کام کرا سکتے ہیں دو چار سال میں جب یہ کام مکمل ہو جائیں تو اسرائیل کی مدد کرتے ہیں کہ اب پھر ان مزاحمت کاروں کو ہلاک کیا جائے، ابھی ایک مسلم ملک کا بیان سب نے دیکھا کہ ''اسرائیل اگر حماس کو تباہ کر دے تو ہم اسکی اور زیادہ مالی مدد کریں گے''، دوران جنگ آنسو بہانے اور پر فریب بیان دینے میں بھی یہ سب آگے آگے رہتے ہیں، حالیہ جنگ کا پسِ منظر صرف اتنا ہے کہ مصر کی اس حکومت کو اسرائیل کی مدد اور مسلم ممالک کی مالی امداد سیا کھاڑ پھینکا گیا جو اسرئیل کے وجود کے لئے خطرہ اور حماس وفلسطین کے لئے باعث تقویت تھی اور جس نے اپنے یک سالہ مدت حکومت میں فلسطینیوں کو کافی راحت اور حماس کو کافی قوت فراہم کی، اس کے بعد زبردستی ایک ایمان فروش کو مصر کے تخت فرعونی پر بٹھایا گیا، تمام تر دھمکیوں اور انتظامات وکوششوں کے باوجود مصری عوام نے صرف ۲۷ فیصد ووٹنگ کی اور صحیح بات یہ ہے کہ ووٹنگ صرف ۱۲ فیصد ہوئی، سابق صدر کے مقابلہ میں موجودہ فرعون کی اہمیت تسلیم کی جائے، اس کے لیے یہ ڈرامہ اسٹیج کیا گیا کہ پہلے فلسطینیوں کو ہلاک کیا جائے، حماس کی طاقت توڑی جائے اور جب بات حد سے بڑھ جائے اور دنیا کے دیگر مذاہب واقوام سے وابستہ انصاف پسند لوگ بھی اس ظلم پر چیخ اٹھیں تو مصر کو ثالثی کے لئے کھڑا کیا جائے، لیکن صد ہزار سلام فلسطینی اسلامی تحریک مزاحمت کے جیالوں اور غزہ کے عوام کی جرأت ایمانی اور مومنانہ فراست کو انہوں نے مصر کی ثالثی اور اسرائیل کی شرطوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ السیسی ملعون خود غاصب ہے تو اس کی ثالثی کا کیا جواز اور جنگ بندی اسرائیل کی شرطوں پر نہیں اہل غزہ کے شرائط پر ہوگی، اس پسِ منظر پر مہر تصدیق سعود الفیصل کے حالیہ بیان نے ثبت کی جنہوں نے اپنے ڈپلومیٹک بلکہ پر فریب بیان میں بہت زور دے کر کہا کہ اسرائیلی بربریت کے خلاف تمام مسلم ممالک متحد ہوں اور مصر کی ثالثی اور اس کے موقف کی حمایت کریں، بین القوسین میں یہ کہ غزہ ہمیشہ محصور رہے، عرصۂ حیات ان پر ہمیشہ تنگ رہے، بیت المقدس غیر آباد اور یہود کے کھیل کود کا اڈہ بنا رہے اور مصر تمام مسلم ممالک کی مدد لیکر اسرائیل کا محافظ بنا رہے اور پھر مسلم ممالک کا اتحاد اسلام پسندوں کو چھوڑ کر، اخوان کو دہشت گرد قرار دے کر اور حماس کی کمر توڑنے کا عزم لیکر کیوں کر ممکن ہوگا؟؟

بات کرنی کچھ تھی لیکن دل کی آگ کہاں تک دبائی جائے خیر!! اسرائیلی بربریت کے خلاف ہم ہندوستان میں

رہ کر اپنی تمام تر بے بسی کے باوجود کیا کر سکتے ہیں، یہ ایک سوال ہے اور اہم سوال ہے، اس کے ضمن میں کچھ معروضات پیش خدمت ہیں اگر قابل غور ہوں تو ان پر ضرور غور کیا جائے۔

ہم خوب دیکھ چکے کہ مسلم ممالک کا کیا حال ہے اور ان کے حکام کا کیا کردار ہے، ان سے مزید کوئی امید فضول ہے، ہم صرف دعاء پر انحصار کر کے بیٹھ جائیں اور سبب کوئی نہ اپنائیں تو یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، دو کام ہم بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔

۱۔ ملک کی تین چار مؤقر تنظیموں کو چاہیے کہ وہ فلسطینی کاز کی اہمیت کے پیش نظر تمام ائمہ مساجد کو تلقین کریں کہ وہ ہر علاقہ اور ہر گاؤں میں فلسطین کاز کی اہمیت پر روشنی ڈالیں اور وہاں سے ہر جمعہ کو تمام نمازیوں کے دستخط سے الگ الگ پوسٹ کارڈ صدر جمہوریہ کو روانہ کریں جس کا مضمون یہ ہو کہ صدر جمہوریہ کو گاندھی جی کا موقف یاد دلایا جائے کہ گاندھی جی فلسطین کو صرف عربوں کا حق اور ان کا وطن سمجھتے تھے اور پھر اندرا گاندھی کے دور حکومت تک ہندوستان میں اسرائیل کا سفارت خانہ نہ رہا، پھر اچانک حالات نے رخ بدلا تو ہندوستان فلسطین کے مظلوموں کے بجائے ظالم اسرائیل کے ساتھ جا کھڑا ہوا، اس ملک کی امن پسندی کو دیکھتے ہوئے صدر جمہوریہ سے درخواست کی جائے کہ ہندوستان اسرائیل سے سفارتی اور تجارتی تعلقات ختم کرے، جب ہر ہفتہ خطوط اور میل کی ہندوستان کے ہر علاقہ سے بہتات ہوگی تو کچھ نہ کچھ مثبت نتیجہ ضرور نکلے گا اور کم از کم یہ کہ ہم اپنے حصہ کا کچھ کام تو ضرور کریں گے، ورنہ صرف وقتی مظاہروں اور کھوکھلے نعروں سے نتیجہ کی امید فضول ہے۔

۲۔ اب تک جب جب غاصب اسرائیل (مقبوضہ فلسطین) نے اپنی بربریت کا مظاہرہ کیا ہے تو مسلمانوں نے واویلا مچانے کے مختلف انداز اپنائے ہیں، کوئی ٹھوس عملی اقدام نہ کیا گیا نہ اس کی امید نظر آتی ہے، معلوم نہیں جو لوگ صرف دعوت کی دہائی دیتے ہیں وہ دعوت کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں، دعوت قرآن میں تجارت و ایجادات کی دنیا سر کرنا اور قوم کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی شامل ہے، قرآن میں اس کی ہدایات ہیں احادیث کی کتابوں اور کتب فقہ میں تجارت کے مستقل ابواب ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ متخصصین فقہ و حدیث ہی تجارت سے سب سے زیادہ دور ہیں اور کم از کم خود نہ سہی تو دوسروں کو اس بات کی کتنی دعوت دی جاتی ہے یا اس پر سرمایہ داروں کو کس قدر اکسایا جاتا ہے کہ وہ تخلیق و اختراع و ایجاد کے میدان میں آئیں اور یہود و نصاریٰ کی مصنوعات کا متبادل پیش کریں، یہاں تو خود اپنے اتنے مسائل ہیں کہ ان سے ہٹ کر اہل ثروت سے لوگ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتے، بس کئی سال میں ایک ہوا چلتی ہے کہ اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے، یہ پورے طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی ہر چیز کا متبادل نہ پیش کیا جائے، انسانی فطرت ضرورت کی اشیاء تب ہی چھوڑ سکتی ہے جب اس کی مضرتوں کی وضاحت کر کے ضرورت کو پورا کرنے والا متبادل پیش کیا جائے، اسلام کی انقلابی تاریخ میں اسی کی کارفرمائی ہے، پھر یہ کہ حضورؐ نے تجارت و زراعت

کے اصول متعین فرمائے ہیں، اختراع و ایجاد کی ہدایات دی ہیں، یہود کے مقابلہ میں مدینہ منورہ میں خود مسلمانوں کا مارکیٹ قائم کیا ہے، سیرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس مارکیٹ کے قیام سے یہودیوں کی اصل طاقت ان کی اقتصادیات کو کیا نقصان پہنچا، علما اور دانشور طبقہ کو چاہیے کہ وہ اہل ثروت، سرمایہ داروں اور بڑے بڑے تاجروں کو وسیع تر ملی وقومی مفاد سمجھا کر اس پر ابھاریں کہ وہ اسرائیلی مصنوعات کے مقابلہ اپنی مصنوعات پیش کریں، اس ضمن میں سودیشی کا نعرہ لگانے والے غیر مسلموں کو بھی ساتھ لے سکتے ہیں، اس طور پر تو ممکن ہے کہ اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ رفتہ رفتہ ہو سکے ورنہ بائیکاٹ کجا!! ہماری حالت یہ ہے کہ جب کسی مسلمان نے اس جانب پیش قدمی بھی کی ہے تو اس کا پروڈکٹ ہمارے مدارس اور علماء و دیندار طبقہ کے گھروں میں بھی نہ چل سکا ہے اور بالآخر خسارہ اٹھا کر اسے بند ہونا پڑا ہے، ایک طرف صورت حال یہ ہے اور دوسری طرف ظالم کی پلاننگ ہے کہ وہ اگر ایک چاکلیٹ بھی بناتا ہے تو یہ سوچ کر بناتا ہے کہ اس سے ملک کی تعمیر قوم کی ترقی اور اسلام دشمنی کے ساتھ مسلمانوں کے وطن و مقدسات کو غصب کرنے میں مدد ملے گی، یہی وجہ ہے کہ اس نے روزمرہ کے استعمال کی ایسی اشیاء بنائی ہیں کہ انہیں ہر غریب وامیر استعمال کرنے کا عادی ہے، اس کے برعکس ہمارے یہاں اگر کوئی بہت سرمایہ دار ہے تو اپنی املاک میں اضافہ کے لئے زمین خریدتا ہے، جویلری بناتا ہے، شیر خریدتا ہے اور بس!! کسی کو خیر کا کام سوجھتا ہے تو مدرسہ واسکول سے آگے نظر نہیں آتا، تجارت دوسروں کے سامان کی اور دوسروں کی محتاج بھی، حد یہ ہے کہ اردو کا اخبار ''انقلاب'' صرف مسلمان خرید کر پڑھتا ہے اور اس کا مالک ہندی اخبار ''دینک جاگرن'' ہے، جس کی آمدنی کا ۲½ فیصد RSS کے لئے مختص ہے ''اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا'' اپنی جیبوں سے RSS کو مضبوط کرتے ہیں اور پھر واویلا مچاتے ہیں، اسی طرح آج کل لوگ دیکھ رہے ہیں کہ چین میں آئے دن مسلمانوں پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جاری ہیں شعائر اسلام تک کی ادائیگی پر پابندی لگائی جارہی ہے اور لوگ بیانات دے کر بڑے خوش ہیں کہ وہ ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کررہے ہیں، جبکہ چین کی پلاننگ کا اور اس کی اقتصادی طاقت کا حال یہ ہے کہ اب کوئی ملک اور کوئی دکان نہیں جہاں چینی مصنوعات کی بھرمار نہ ہو، بچوں کی عین اسلامی تربیت کے لئے معاون کھلونے، قرآن، اسلامی آداب، مسنون دعائیں سکھانے والے کھلونے چین بناتا ہے، آپ کی جیب سے پیسہ لیکر مضبوط ہوتا ہے اور پھر اپنے یہاں بسنے والے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتا ہے، ٹھیک یہی حال اسرائیلی مصنوعات کا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس میدان میں محنت کی جائے اور اس کو عین اسلامی خدمت سمجھا جائے اور اس طرح دشمن کو کمزور کرنے کے لئے ٹھوس اقدام کیا جائے،

آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد:

ملک بھر میں آزادی کا ۶۷ واں جشن پورے جوش وخروش کے ساتھ منایا جارہا ہے، شہداء وطن کی قربانیوں کے تذکرے ہورہے ہیں، مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کو یاد کیا جارہا ہے، مسلمان پوری قوت سے اپنے اسلاف اور اپنے علماء

کی قربانیوں اور جنگِ آزادی میں ان کے کردار پر روشنی ڈال رہے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو ذرا صورت حال کی صحیح عکاسی ہوگی کہ ایک طرح ہندوستان میں اپنے وجود، اپنی شہریت اور آزادی کی جنگ میں اپنے کردار کا دفاع کررہے ہیں، ظاہر ہے کہ متعصب مورخین نے تاریخ کو مسخ کرنے کا جو کام کیا اس کے باوجود تاریخ ہمارے نمایاں کردار، بے مثال وفاداریوں اور جان ومال کی سب سے زیادہ قربانیوں کے شواہد وداستانوں سے بھری پڑی ہے جس کا اعتراف اغیار نے بھی کیا ہے، اس کا بنیادی سبب اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد ہے، جس کو آج برادران وطن بدنام کرنے کی ہر کوشش کررہے ہیں، خود سازش کرتے ہیں، افراد تیار کرتے ہیں، دھماکے کراتے ہیں اور ''برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر''، اس ملک پر مسلمانوں نے ایک ہزار سالوں تک حکومت کی، اس کی تعمیر وتوسیع میں ان کا خون پسینہ شامل رہا، لیکن جب انگریز کمال عیاری کے ساتھ قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تو سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر جہاد کی فرضیت کا فتویٰ دیا، ظاہر ہے کہ مسلمان ہی اس ملک کے معمار وحکمراں تھے اور ان ہی سے ملک چھینا گیا تھا تو پیش پیش رہنا ان ہی کا حق بھی تھا، ایسا ہوا بھی کہ آزادی کی جنگ میں از ابتدا تا انتہاء مسلمان سب سے آگے رہے اور سب سے زیادہ قربانیاں پیش کیں۔

لیکن صد افسوس آج ۶۷ سال بعد بھی ہماری تحقیق کا سارا زور اس پر صرف کررہے ہیں کہ آزادی میں مسلمانوں کا کیا رول تھا، علماء کا کیا کردار تھا، اس کے متعدد اسباب ہیں، بعض کا تعلق آزادی کے وقت ہوئی تقسیم سے ہے، جن پر اب بحث فضول ہے، لیکن بڑا سبب یہ ہے کہ ایک سازش کے تحت مسلمانوں کو آزادی کے بعد دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا گیا جس سے مسلمان اب تک نہ نکل پائے، اس وقت کی جو بھی پالیسی اور مجبوری کہی جائے لیکن ہوا یہ کہ مسلمانوں نے کانگریس میں اپنے کو ضم کرلیا، رفتہ رفتہ کانگریس نے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے ساتھ خوف وہراس کے اندھیروں میں قید کردیا اور اس حالت میں پہنچادیا کہ **مسلمان اپنے وجود کو بچانے کی تو فکر کریں لیکن اپنے وجود کو منوانے کا خیال تک نہ آئے، اور اگر کوئی صاحب فکر ایسا سوچ لے تو سب تماش بین بن کر نہ صرف یہ دیکھنے لگیں کہ اب اس کا کیا حشر ہوگا بلکہ زیادہ خیر خواہ اسے سمجھانے لگیں، خطرات سے کھیلنا اچھی بات نہیں اس سے ہمارا وجود ہی ختم ہوجائے گا۔**

ایک جانب ہماری حالت یہ ہے اور اسی کے سبب ہمارے علماء اور دانشوران نے کانگریس نوازی (ان کے خیال میں جمہوریت نوازی) میں بغیر کسی منصوبہ کے اسقدر ''مودی'' کے خوف کا شور مچایا کہ وہ غالب آکر رہا، یہاں صرف بیانات تھے، ہنگامہ تھا، ادھر منصوبہ بندی تھی اور ہمارے اسی ہنگامہ پر ان کے اتحاد کی بنیاد تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ خوف کی ایک اور لہر چلی، بڑی تعداد اپنی زندگی اور شہریت پر ہی ڈرنے لگی جبکہ پہلے سے ہی کانگریس نے اپنے آپ کو دوسرے درجہ کا شہری تصور کرنے کی فضا بنا رکھی ہے، اور اب بھی دیکھیے تو مودی کی زبان سے کسی طرح کا ایسا بیان صادر نہیں ہوتا جس سے اقلیت دشمنی یا فرقہ پرستی کا مطلب نکالا جائے، ابھی یوم آزادی کے خطاب میں مختلف سماجی پہلوؤں پر بڑی مؤثر گفتگو، ہر

گفتگو میں سوا سو کروڑ ہندوستانی کے لفظ سے خطاب، بلکہ اس خطاب میں تو پچھلے گناہوں سے توبہ کی بھی بات کہہ گئے، دانشمند اور منصوبہ بند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، زبان سے واویلا نہیں مچاتے، ٹھوس حکمت عملی اختیار کر کے مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں، ایک طرف تو یہ خوش بیانی دوسری طرف ملک بھر کے اہم عہدوں پر RSS کے تربیت یافتوں کی تقرری، خود حکمراں جماعت کی سربراہی ایک ایسے شخص کو سپرد کرنے کا عمل، جس نے ہندوستان کے وقار کو مجروح کرنے کے ساتھ اس جماعت سے جو تھوڑی بہت بھی جمہوریت پسندی کی امید تھی وہ بھی ختم کر دیا، سب جانتے ہیں قانونی و اخلاقی بہر اعتبار وہ شخص ایسے کسی عہدہ کا اہل نہیں، لیکن اس سے زیادہ کوئی فرقہ پرست وتخریب کاری کا ماہر اب ان کے درمیان رہا بھی نہیں، اسی لیے باگ ڈور اس کو سونپی گئی۔

مختصر یہ کہ اس وقت جو صورت حال ہے اس کی ذمہ داری قدیم ترین ملی تنظیموں اور رہبران ملت پر عائد ہوتی ہے، اس لیے اب بحث یہ نہیں ہونی چاہیے کہ آزادی میں علماء کا کیا کردار تھا، غور اس پر کرنا چاہیے کہ آزادی کے بعد علماء نے کس پہلو سے قوم کی رہنمائی کی اور کس پہلو سے رہنمائی نہ ہو سکی، ایسا تو نہیں بعض روایات کو مضبوطی سے تھامنے کے سبب بعض اہم ضروریات سے غفلت برتی گئی، جس کی سزا پوری قوم کو اس طرح بھگتنی پڑ رہی ہے کہ اپنے وجود اور اپنے کردار کا بھی دفاع کرنا پڑ رہا ہے اور ثابت شدہ حقائق کے تحفظ کے لئے کوششیں کرنی پڑ رہی ہیں، سچ یہ ہے کہ اب آزادی میں ہمارے کردار سے زیادہ آزادی کے بعد ہمارے کردار سے بحث ہونی چاہیے اور پھر اس کے نتائج پر اقدامات کرنے چاہیے، کیوں کہ اہل فکر ونظر پر خوب واضح ہے کہ آزادی کے بعد ہماری قیادت باقی، ماندہ کو بچانے میں اس طرح مصروف ہوئی کہ دوسروں کی دست نگر بنتی چلی گئی اور اب اس دلدل سے نکلنا گویا دشوار کیا ناممکن ہو گیا، دوسرے لوگ اس بات کو سمجھ گئے اور وہ خود تو آگے نکلتے چلے گئے اور سب نے الگ الگ ہماری قوم کے استحصال کا حربہ اپنایا، ہمارے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے اور دور آخر میں ان کی بہتات ہو گئی جو محض اپنے ذاتی اور حقیر مطالب اور ادنی ترین مفادات کے لئے ایک آدھ دعوتوں اور ایک آدھ اخباری نوٹو میں اپنا اور اپنے حلقہ کا سودا کرنے لگے، فکر وبصیرت کجا؟؟ اپنی عزت کا بھی پاس ولحاظ نہ رہا، حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی جب رئیس الفقیر علی باب الأمیر کا سبق پڑھنے پڑھانے والے موقع بہ موقع امراء اور وزراء کے سامنے باادب کھڑے اور بیٹھے نظر آنے لگے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت (قسط-۸)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ہے''

پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں

تحریر: مسٹر اڈیار ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

انسان کے اندر سچائی، اخلاق اور حیا وغیرہ کو پیدا کرنے کے لیے اور اس کی تعلیم دینے کے لیے نبی کریمؐ مبعوث ہوئے۔ انہوں نے بڑی ہی سادگی سے یہ عظیم تعلیمات، حکمت سے بھرپور تعلیمات انسانوں کو دیں۔

فلاں خدا کے اوتار ہیں، فلاں خدا کے جزو ہیں، فلاں خدا کے بیٹے ہیں، ان دعوؤں کے ساتھ جو مذاہب اٹھے ان کو دنیا نے مانا اور ان کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کو نہ خدا کہا جاتا ہے، نہ خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے، نہ خدا کا اوتار کہا جاتا ہے۔

نبی کریم سیدھے سادے انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک پاک باز انسان، بلند اخلاق کے حامل انسان۔ قرآن اعلان کرتا ہے:

''اے نبی! کہو کہ میں تو بس ایک انسان ہوں تمہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔'' (الکہف ۱۱۰)

قرآن میں متعدد جگہ نبی کریم کی زبانی یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ وہ کہیں کہ وہ انسان ہیں، پاکباز انسان۔

☆ میں کسی عجوبہ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔

☆ میرے پاس آسمانوں کے خزانے نہیں ہیں۔

☆ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔

☆ میں انسان ہوں، تم ہی جیسا انسان۔

ان دعووں کے ساتھ اگر کسی نے کسی دین کو قائم کیا ہے تو وہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:

''تم مردوں کو نہیں سنا سکتے، نہ ان بہروں تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو، تم تو اپنی بات ان ہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن

جاتے ہیں‘‘ (النمل ۸۰/۸۱)

لہذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نبی کریمؐ نے کسی عجوبہ کے مظاہرہ کی کوشش نہیں فرمائی اور نہ خدا کے جزو ہونے کا کوئی دعویٰ کیا۔ سیدھی راہ سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجے گئے وہ ایک انسان ہی تھے۔

بات صرف اتنی ہی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس راہ راست سے اگر نبی کریمؐ بھی ہٹیں تو کوئی طاقت انہیں خدا کے عتاب سے نہ بچا سکے گی:

’’اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان (بے دینوں) کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔‘‘ (البقرہ ۱۲۰)

جب ہم ان آیات کو پڑھتے ہیں تو دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ انسانیت کے لیے جسے اسوۂ حسنہ کہا گیا، کیا وہ خدا کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کرسکتا ہے کہ وہ سزا کا مستحق ہو، نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی قرآن واضح الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے کہ نبیؐ سے بھی غلطی ہوجائے تو ان کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست و مددگار نہیں ہوگا۔

کیا کسی مذہبی کتاب میں اس کے لانے والے کو اتنی صاف اور واضح تنبیہ کی گئی ہے؟ میں کہوں گا کہ بالکل نہیں۔

میں ایک انسان ہوں تنہی جیسا میں بھی کوتاہی کروں تو اللہ کے ہاں پکڑا جاؤں گا، اس دعوے کے ساتھ کسی دین کو پیش کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہ نبی کریمؐ ہیں۔ کوئی دین ایسا پیغمبر دے سکا ہے تو وہ صرف دینِ اسلام ہے۔

پھر اس کے ساتھ ایک حیرتناک بات اور بھی ہے جو ہمیں عام مذاہب کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ آنحضورؐ کو آپؐ کے زمانے میں بھی انسان ہی سمجھا گیا اور وفات کے بعد بھی آج تک انسان ہی سمجھا جا رہا ہے۔ اور تا قیامت انسان ہی سمجھا جائے گا۔

کتنے ہی مذہبی قائدین انسان کی حیثیت میں پیدا ہوئے، زندگی میں انسان کی حیثیت سے ہی رہے۔ انسانی سماج میں اصلاح اور بھلائی کے کام کیے اور پھر وفات پائی لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی انہیں خدا کا درجہ دے دیا گیا۔

مثال کے طور پر گوتم بدھ کو لیجیے۔ وہ پیدا تو انسان ہی ہوئے تھے ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ نیک عمل کرتے تھے اور بھلائی کی تلقین کرتے تھے لیکن جیسے ہی وہ فوت ہوئے وہ خدا بنا لیے گئے۔ لیکن اسلام میں نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی کو کبھی خدا کا درجہ نہیں دیا گیا۔ وہ بس انسان ہیں، خلقِ عظیم سے متصف انسان اور پیغمبر ہونے کی حیثیت سے ساری نوعِ انسانی کے لیے اسوۂ حسنہ، بہترین نمونہ۔

اسی حد تک آپؐ کی تعریف و توصیف پچھلے چودہ سو سالوں سے کی جارہی ہے۔ الوہیت کا درجہ آپؐ کو کبھی نہیں دیا گیا۔

☆☆☆

گوشۂ سیرت

رسول اکرم ﷺ کا داعیانہ کردار

مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد
mdtanzimalam@gmaim.com

دعوت واصلاح کی کوششیں ہر چہار جانب سے ہو رہی ہیں، اپنی اپنی بساط اور سطح کے مطابق مختلف ادارے، تنظیمیں اور جماعتیں اس مبارک مشن میں مصروف ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انفرادی اوراجتماعی طور پر کی جانے والی دعوتی واصلاحی یہ تمام محنتیں سراہے جانے کے قابل ہیں کہ ان ہی کی محنتوں اورکوششوں سے امت کا ایک حصہ اسلام سے وابستہ ہے، ان میں دینی شعور وآگہی پائی جاتی ہے، اوروہ کسی نہ کسی درجے میں بیدار نظر آتے ہیں، مگر افسوس اس بات پر ہے کہ جس تیزی اور کثرت کے ساتھ یہ جدوجہد مؤثر ہونی چاہئے اتنی نہیں ہے، محنت کے اعتبار سے نتائج بہت مایوس کون ثابت ہورہے ہیں، تصنیف وتالیف وعظ وخطابت اورگشت وملاقات کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے؛ بلکہ پہلے کے مقابلے میں کافی اضافہ ہوا ہے، تاہم اصلاح کی رفتار بہت سست ہے، برائیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی؛ بلکہ شراب نوشی، عصمت ریزی، بے حیائی، سود خوری، اورظلم وزیادتی کے واقعات زیادہ رونما ہورہے ہیں، اس مسئلہ کا حل ہمیں سب سے بڑے داعیٔ حق رسول اللہ اکرم ﷺ کے طریقہ دعوت اورآپ ﷺ کی مبارک زندگی کے نقوش میں ڈھونڈنا چاہئے کہ آخر وہ کیا اسباب وعوامل تھے جن سے دعوتِ حق اتنی مؤثر ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا جزیرۃ العرب اسلام میں داخل ہوگیا، مخالفتوں کے شدید طوفان کے رخ میں حق کا چراغ جلایا گیا اور بجھنے کے بجائے اس کی لَو اتنی تیز ہوگئی کہ مخالفین کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، اوران میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ مذہب اسلام پر غلط نگاہ ڈال سکیں، اتنا عظیم انقلاب کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کسی انقلاب کا تصور نہیں ہوسکتا، ایک وہ شخص جو مکہ کے گندے ماحول سے واقف ہو اگر بعثت نبوی ﷺ کے زمانے میں مکہ سے باہر چلا جاتا اور بیس بائیس سال کے بعد واپس آتا تو یہاں کی عدالت، صداقت، شجاعت، خوف خدا، ہمدردی اورانسانیت نوازی کا ماحول دیکھ کر اسے یقین ہی نہ ہوتا کہ کیا یہ وہی سرزمین مکہ ہے جہاں سے وہ کچھ دنوں پہلے چھوڑ کر گیا تھا اس مختصر عرصے میں اس عظیم ترین انقلاب پر ہر ایک کو حیرت ہوتی ہے، آیئے دیکھیں آج کے داعیان کے لئے

سیرت میں کیا پیغام پوشیدہ ہے؟

۱-پختہ یقین:

دعوت کی قبولیت اور مؤثر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دعوت دینے والا جس دین اور طریقہ کی دعوت دے رہا ہے، اسے اس پر مکمل اعتماد اور یقین ہو۔ داعی کو اگر خود اعتمادی نہ ہو اور جس راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے اس کے حق ہونے کا ایقان نہ ہو تو دعوت میں تاثیر پیدا نہ ہوگی، رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو جب اسلام کی دعوت دی تو اس بات کے مکمل یقین کے ساتھ کہ یہی مذہب حق ہے اور اس میں جو قوت وصداقت ہے وہ بہت جلد اسے تمام ادیان پر غالب کرے گی۔ چنانچہ شروع مکی دور میں ایک مرتبہ جب آپ ﷺ نے بیت اللہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے خانۂ کعبہ کا دوازہ کھولنے کے لئے کہا تو اس نے انکار کردیا یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف اسلام کی مخالفت کی جارہی تھی؛ بلکہ مخالفتوں کا ایک طوفان برپا تھا، مایوس کن حالات تھے، بظاہر اس دین کے غالب ہونے کے آثار نہیں تھے، مگر اس سخت اور ناساز گار حالات میں بھی رسول اکرم ﷺ نے پورے یقین کے ساتھ ارشاد فرمایا: ایک دن آنے والا ہے جب کہ یہ کنجی خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے تفویض کریں گے۔ (المواهب اللدنيه قسطلانی: ۱۵۸/۱)

اسی طرح ایک موقع پر خباب بن ارت اور دیگر بعض وہ کمزور صحابہ جو کفار مکہ کے ظلم کے شکار تھے، حضور ﷺ سے انہوں نے اپنی تکالیف اور غیر معمولی اذیتوں کا شکوہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والله ليتمنَّ الله هذا الأمر حتى يسيرالراكب من صنعاء الىٰ حضرموت لايخاف الَّا الله والذئب على غنمه ولكنكم تستعجلون (صحيح بخاری:۶۹۴۳)

اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اس دین کو ضرور مرحلہ تکمیل تک پہنچائے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء یمن سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسلام کے عادلانہ نظام کے سبب اسے اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا، یہاں تک کہ بکری کے مالک کو اپنی بکری پر بھیڑیئے کے حملے کا بھی ڈر نہ ہوگا؛ لیکن تم لوگ ذرا عجلت سے کام لے رہے ہو۔

ان دونوں واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ جس دین کی دعوت دے رہے تھے اس کے کامیاب ہونے پر کس قدر یقین تھا، کسی تردد اور شبہ کے بغیر مشن کی تکمیل کا یہ یقین روز اول سے پایا جارہا تھا اور اسی پختہ یقین کے گردساری سرگرمیاں گردش کررہی تھیں، پوری قوت کے ساتھ آپ ﷺ نے دعوت پیش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد عرب اسلام کے پرچم تلے جمع ہوگئے، اور تمام ادیان پر یہ دین غالب آگیا، آج دعوت کا کام کرنے والوں میں اس یقین کی کمی ہے، خود اعتمادی اور اپنی آواز پر ایقان نہیں پایا جاتا، بس دعوت کا کام کرنے کا ایک شوق ہے، کررہے ہیں، مگر کوئی بڑا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ اس طرح زمانہ گذر جائے پھر بھی دعوت کی سرگرمیاں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں۔

۲-مشن کی کامیابی کی تڑپ:

قلبی تڑپ اور اندرون کے جذبہ کا کسی مشن کی کامیابی میں بنیادی کردار ہوتا ہے، کسی فن کے سیکھنے والے میں اگر اندر کی

تڑپ ہوتی ہے تو کٹھن فن بھی جلدی آجاتا ہے، اور تڑپ نہ ہو تو آسان فن بھی مشکل بن جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح دعوت کا کام کرنے والوں کے دلوں میں انسانیت کی فلاح کی تڑپ اور جذبۂ صادق پایا جائے تو زبان سے نکلنے والا ہر لفظ بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور سیدھی سادھی بات بھی دل ودماغ میں ہلچل مچادیتی ہے، رسول اکرم ﷺ کی دعوت اس لئے بھی جلد مقبول ہوئی کہ قلب اطہر میں پوری انسانیت کی کامیابی کی تڑپ بدرجۂ اتم موجود تھی، آپ ﷺ ہر وقت اسی فکر میں پریشان رہتے کہ کس طرح سارے لوگ جہنم کے شعلوں سے بچ جائیں اور فلاح آخرت کے مستحق بن جائیں، یہ کڑھن اس قدر تیز تھی کہ شب وروز میں اطمینان کا سانس لینا دشوار ہوگیا تھا، جان خطرے میں پڑگئی تھی، قرآن کریم نے اس نبوی ﷺ تڑپ کو اس طرح بیان کیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ أَسَفًا (الكهف: ٦)

تو کیا آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودیں گے، اگر یہ لوگ اس کتاب پر ایمان نہ لائیں۔

دعوت دین کے لئے رسول اللہ ﷺ کی تڑپ اس مثال سے واضح ہوتی ہے کہ جب کفار مکہ نے آپ ﷺ کے چچا ابوطالب پر اجتماعی طور پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حمایت ترک کردیں، ابوطالب کی سرپرستی کی وجہ سے پوری قوت آپ ﷺ کو حاصل تھی؛ لیکن کفار مکہ کے دباؤ کے سبب جب انہوں نے آپ ﷺ سے بات چیت کی اور دعوت حق میں نرم پہلو اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو آپ ﷺ نے وہ مشہور جواب دیا کہ خواہ یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب، اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب کیوں نہ لاکر رکھ دیں میں اپنے مشن اور دعوت سے باز نہیں آسکتا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کردے، یا اس میں اپنی جان کھپادوں گا۔

اس جملے میں آپ ﷺ کی جو قلبی تڑپ پوشیدہ ہے اسے بیان نہیں کیا جاسکتا، تکمیل مشن کی یہ تڑپ تھی جس نے ہر مشکل کو آسان بنادیا اور اسلام کے فروغ کی راہیں ہموار ہوئیں، جس جگہ بظاہر حالات ناموافق تھے، اور باطل قوتوں کا گھیرا بڑا مضبوط تھا، اس نبوی ﷺ تڑپ اور اندورنی جذبہ نے باطل کے حصار کو توڑ کر حالات کو اسلام کے موافق بنادیا، اس موقع پر شروع اسلام میں پیش آئے حضرت حمزہ ؓ کا وہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہئے جب حضرت حمزہ ؓ شکار کے لئے گئے ہوئے تھے، واپسی میں عبداللہ بن جدعان کی باندی نے انہیں ابوجہل کی بدتمیزی سے واقف کراتے ہوئے کہا کہ آج آپ کے بھتیجے محمد بن عبداللہ کو ابوجہل نے بہت سخت وست کہا اور ان کی شان میں نازیبا کلمات کہے یتیم بھتیجے کے بارے میں یہ کلمات سن کر حضرت حمزہ ؓ کی حمیت اور غیرت بھڑک اٹھی، سیدھے حرم پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا، اس سے بھتیجے کا بدلہ لیا اور آپ ﷺ کے پاس پہنچ کر کہنے لگے، خوش ہوجایئے میں نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کا بدلہ لے لیا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چچا! میں اس اقدام سے قطعاً خوش نہیں ہوں، میں اس دنیا میں سراپا رحمت بن کر آیا ہوں، انتقام لینے نہیں آیا ہوں، میری خوشی اس میں ہے کہ آپ کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کے اجالے میں آجائیں، اضطراب آمیز یہ جملہ سن کر حضرت حمزہ

ﷺ اسلام میں داخل ہو گئے۔

ایک ایک شخص کو ایمان کی چوکھٹ پر لانے کی بے چینی جسم اطہر میں رچی بسی تھی، دن اور رات کا فرق مٹ گیا تھا، ساری انسانیت کے لئے آپ ﷺ کی تڑپ تھی، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ کسی طرح بھی اللہ کے بندے اللہ سے جٹ جائیں، سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کے بجائے ایک ذات حق سے تعلق مضبوط ہو جائے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ نجات کا ذریعہ ہے، دعوت کے کارکنان میں اس اضطراب اور تڑپ کی ضرورت ہے، ان کی نظر مسلک اور مذہب تک محدود نہ ہو بلکہ ساری انسانیت کی نجات ان کا نصب العین ہو، وسعت نظری کے ساتھ جب تڑپ کی آمیزش ہوگی اور جذبۂ صادق دل میں موجود ہوگا تو دعوت کی راہ میں نکلنے والے ہر قدم اور اس مقصد کے لئے بولی اور لکھی جانے والی ہر تحریر میں تاثیر ہوگی، جو دلوں کو چھید کر کے جسم کی گہرائی تک پہنچے گی اور کم وقت میں دعوت کا کام نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

۳- محنت اور جہد مسلسل:

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد رسول اکرم ﷺ نے اپنے خاندان اور گھر والوں پر اسلام کو پیش کیا، یہ موقع ان کی خوشی اور مسرت کے اظہار کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو ختمِ نبوت کا شرف عطا کیا، اس کے بدولت قیامت تک یہ خاندان مبارک خاندان ہوگا، اور سارے لوگ اس پر اپنی جان نچھاور کریں گے، مگر کیا کیجئے، .....حسد اور خاندانی رقابت نے چچا ابولہب، ابوجہل اور دوسرے بعض اہل خاندان کو مخالفت پر اکسایا اور اس قدر شدید عداوت پر وہ لوگ اتر آئے کہ خود اپنے ہی گھر اور اپنی ہی گلی میں چلنا پھرنا اور اسلام کی دعوت دینا مشکل بن گیا، آپ ﷺ نے صبر کیا اور اپنے مشن میں لگے رہے، مکہ والوں کو سمجھایا اور ان سے کہا:

"فإن تقبلوا منی ماجئتکم به فهو حظکم من الدنیا والآخرة" (سیرۃ ابن إسحاق:۱۷۹/۴)

''تم اگر میری وہ دعوت قبول کرلو جسے میں پیش کر رہا ہوں، تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے''

دنیا و آخرت کی بھلائی کے یہ سادہ الفاظ اپنے اندر غیر معمولی معنویت رکھتے ہیں، جاہلی نظام حیات کو چھوڑ کر آسمانی عادلانہ نظام برپا کرنے سے دنیا بھی ان کی سنورتی اور آخرت کی ابدی زندگی بھی بہتر ہوتی اور ہمیشہ ہمیش کے لئے وہ رحمت الٰہی کے مستحق ہوتے تاہم کفار مکہ نے اس کا انکار کر دیا اور صرف انکار پر ہی معاملہ ختم نہ ہوا بلکہ مخالفتوں کا طوفان کھڑا کر دیا، تشدد کی راہ اختیار کرتے ہوئے اسلام قبول کرنے والوں کو ایسی اذیت دی کہ سن کر بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو صبر و استقامت کی تعلیم دی اور خود کام میں لگے رہے ۱۲/سال مسلسل محنت کے بعد بھی مکہ میں دعوت اسلام کے فروغ کے آثار جب مضمحل نظر آئے تو آپ ﷺ نے طائف کا سفر کیا کہ شاید یہاں کے لوگ اس پیغام کو قبول کر لیں مگر وہاں بھی کامیابی نہیں ملی، ظالموں نے بازاری لڑکوں کو اکسا دیا جنہوں نے اس قدر پتھر برسائے کہ آپ ﷺ زخمی ہو گئے، اور شدید چوٹ پہنچی پھر بھی بددعا کرنا ان کے لئے گوارا نہ کیا، اور پھر ایک وقت آیا جب گھر بار چھوڑ کر

مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم ملا، جس شہر اور گاؤں میں انسان پرورش پاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے اس سے محبت ایک فطری بات ہے، رگ وریشے میں اس جگہ کی محبت چھا جاتی ہے، اور وہاں کے شجر و حجر اور نشیب و فراز سے بھی ایک انسیت پیدا ہو جاتی ہے، دین کی خاطر اپنے گھر بار کو چھوڑ دینا معمولی قربانی نہیں تھی، مگر یہ قربانی بھی آپ ﷺ نے دی اور مکہ میں نبوت کے تیرہ سال گذارنے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، مگر مکہ چھوڑنے کے بعد بھی دشمنانِ اسلام کو چین نہ آیا، وہ مختلف چیرہ دستیوں اور سازشوں میں لگے رہے، جس کے نتیجے میں بدر، احد، خندق وغیرہ غزوات پیش آئے، سیکڑوں صحابۂ کرام کو ان لوگوں نے شہید کیا، مصائب و مشکلات کی راہ سے گذرتے ہوئے جب صلح حدیبیہ میں کچھ اطمینان کا سانس لینے کا موقع آیا تو آپ ﷺ نے بین الاقوامی دعوت کا سلسلہ شروع کیا۔ روم، ایران، مصر، حبشہ، وغیرہ کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط لکھے اور انہیں اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی، اس طرح اگر سیرت کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی وفات تک تسلسل کے ساتھ خدا کے بندوں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے، اسلام کے وہ سپاہی جو دعوت کا کچھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ان واقعات میں بڑا پیغام ہے، وہ جہد مسلسل کے بغیر اگر چاہیں کہ ان کا دعوتی مشن کامیاب ہو، ہرگز نہیں ہوسکتا، اس کے لئے اپنے وجود کو کھپانے کی ضرورت ہے، زندگی کی دیگر ضروریات پر جب دعوت دین کو غلبہ حاصل ہو جائے اور ذہن و دماغ میں اس کی فکر رچ بس جائے تو یہاں سے محنت ثمر آور ہوتی ہے اور اب امید کی جاسکتی ہے کہ نصب العین مرحلۂ تکمیل تک پہنچے گا۔

۴۔ بلند اخلاق:

کسی بھی مشن اور مقصد کی کامیابی کے لئے اعلیٰ اخلاق بنیادی حیثیت رکھتا ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو بلند اخلاق پر فائز کیا تھا، اپنے تو اپنے غیروں نے بھی آپ ﷺ کے بلند اخلاق کی شہادت دی، کفار مکہ امین اور صادق کہہ کر پکارتے اور اس پر سب کا اتفاق تھا، اسی طرح آپ ﷺ کے حسن اخلاق اور کریمانہ سلوک پر سب کو یقین تھا، بیشتر افراد اسی عالی اخلاق اور رحیمانہ برتاؤ کے سبب اسلام میں داخل ہوئے، جانی دشمنوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ نے ایسا برتاؤ کیا کہ وہ آپ کے شیدائی بن گئے، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اخلاق نبوی کے واقعات کثرت سے موجود ہیں، جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، ستر کفار مارے گئے اور ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، یہ پہلا موقع تھا جب مسلمان کفار کی شرارتوں کا بدلہ لے سکتے تھے، ابھی ہجرت کا زمانہ قریب تھا، دشمنوں کے ستانے کے واقعات تازہ تھے، زخم ہرا بھرا تھا، دنیا کے دستور کے مطابق قیدیوں کو ٹارچر کرتے، انہیں مارتے اور پیٹتے، مختلف اذیتوں کے ذریعہ اپنے غم کو ہلکا کر سکتے تھے، مگر قربان جایئے رسول اکرم ﷺ کے عالی اخلاق پر آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو قیدی حوالہ کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ بھی ارشاد فرمایا: " استوصوا بالأساری خیرًا" (زرقانی: ۱/۴۳۱) ''قیدیوں کے ساتھ بھلائی اور اچھا سلوک کرو'' - اس نصیحت کا اثر یہ ہوا کہ صحابۂ کرام پہلے اپنے قیدیوں کو کھلاتے

بعد میں خود کھاتے اور اگر کھانا نہ بچتا تو کھجور پر اکتفا کرتے، مصعب بن عمیر کے حقیقی بھائی ابوعزیز بن عمیر بھی قیدیوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ میں انصار کے جس گھر میں تھا ان کا حال یہ تھا کہ صبح وشام تھوڑی بہت جو روٹی پکتی وہ مجھے کھلا دیتے اور خود کھجور پر گذارہ کرتے، میں شرماتا اور ان سے روٹی کھانے کے لئے کہتا تو فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے؛ اس لئے روٹی تم کھاؤ، ہم کھجور وغیرہ کچھ کھالیں گے۔ (مجمع الزوائد:۶/۶)

ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کہیں بیٹھے ہوے تھے، وہاں سے ایک غیر مسلم یہودی کا جنازہ گذرا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، آپ ﷺ کی وجہ سے صحابہ بھی کھڑے ہوگئے، جب جنازہ گذر گیا تو کسی نے سوال کیا: یا رسول اللہ! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا، اس کے احترام میں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أليست نفسًا" (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲) ''کیا وہ انسان نہیں تھا''، یعنی ہم نے انسانیت کا احترام کیا ہے اور انسان ہونے میں تمام نوع بنی آدم یکساں ہیں۔ اخلاق وانسانیت کے یہ واقعات کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی قوم وملت کی تفریق کے بغیر انسانیت کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ اخلاق عظیم کا برتاؤ کیا، جس نے دلوں کو نرم بنادیا اور جانی دشمنوں کے قلوب میں بھی اسلام کی محبت جاگ اٹھی، پھر وہ دربار نبوت کے ایسے عاشق ہوئے کہ جاں نثاروں کی داستانوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

دعوت ایک اونچا عمل ہے، اس کا مقام جتنا بلند ہے اسی قدر یہ ذہنی وسعت، بلند نظری، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ جذبات کا متقاضی ہے، دعوت خواہ مذہب کی ہو یا اصلاحِ اعمال کی دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ دعوت کے کارکنان جذباتیت سے دور رہیں، ممکن ہے کہ سامنے والا آپ کی بات پر چراغ پا ہوجائے اور وہ برا بھلا کہہ دے، مگر آپ اپنی زبان پر قابو رکھیے، اسے کسی بھی حال میں آلودہ ہونے نہ دیجیے، بگڑے ہوئے حالات اور بگڑے ہوے ذہنوں کو صحیح رخ دینا ہی دعوت کی کامیابی ہے، بسا اوقات عوام کے نازیبا الفاظ اور تلخ لہجوں کو دعوت دینے والے برداشت نہیں کرسکتے، ان کے ساتھ یہ بھی الجھ پڑتے ہیں اور زبان پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے، ایسے لوگوں کے لئے دعوت کے میدان میں کام کرنا مشکل ہے، ان سے دعوت کے مشن کو نفع کم اور نقصان زیادہ ہوسکتا ہے، حکمت ودانائی، مزاج شناسی، شیریں زبانی، نرم لہجہ اور اعلیٰ اخلاق کسی بھی نصب العین کو پروان چڑھانے اور کامیاب کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، یہ داعیانِ حق کا سرمایہ ہے اسے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیجئے اور اپنی دعوتی واصلاحی کوششوں کو کسی قوم، جماعت، مسلک اور علاقہ کے ساتھ خاص کئے بغیر پوری انسانیت کے لئے کام کیجئے، مذہب اسلام کسی خاص گروہ اور قوم کے لئے نہیں؛ بلکہ رہتی دنیا تک ساری انسانیت کے لئے راہ نجات ہے۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

عظمتِ صحابہ

آدم علی ندوی

أسوۂ صحابہ کی معنویت

مسلمانوں کا سب سے بڑا عقیدہ عقیدۂ آخرت ہے، ان کا ہر عمل ہر قدم آخرت کی کامیابی و ناکامی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اٹھتا ہے، لیکن آج کی مادیت نے اس عقیدہ کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اور انسان کی نگاہ کو دنیا تک محدود کر کے آخرت سے غافل کر دیا، موت، قبر، قیامت، حشر، جنت و دوزخ، جزاء وسزا کو انسان بھولتا چلا گیا، خشیت ورقت کی کیفیات دلوں سے نکل گئیں، دنیا اور دنیاوی لہو ولعب میں مگن رہنے کو فیشن بنالیا گیا۔ آخرت کو یاد کر کے رونے کو صحت کے لئے مضر قرار دیا گیا۔

ایسے حالات میں صحابہ کرام کی پاک زندگیاں، ہر کام میں آخرت کو مدنظر رکھنے کے ان کے نمونے ومثالیں، ان کا صدق وخلوص، ایثار وجانثاری ہی وہ شاہراہ ہے جو انسان کو بچا سکتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ صحابہ کی حکایات، ان کی زندگیوں کو پیش کیا جائے اور لوگوں کو صحیح اور کامل ایمان کے لوگوں کو دکھایا جائے جن کی روشنی میں آخرت کی منزل کا سفر طے کیا جا سکے۔

قرآن وحدیث میں صحابہ کا تذکرہ

اللہ نے دنیا میں انبیاء کے بعد سب سے بہتر جماعت صحابہ کو بنایا اور اس کی شہادت اپنے پاک کلام میں نازل فرمائی انہیں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کنتم خیر أمة ۔آل عمران/۱۱۰ (تم لوگ اچھی جماعت ہو) اور ان کا ظاہر وباطن ایسا پاکیزہ اور چمکدار بنایا جس کی روشنی اور کرنیں کرۂ ارضی کو تا قیامت روشن کرتی رہیں گی اور لوگ اس روشنی میں عبادات ومعاملات اور نظام معاشرت کے منازل طے کریں گے۔ أصحابی کالنجوم (میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں) ان کے ایمان واعمال کو معیار قرار دیکر ان کی اطاعت اس طرح واجب کردی کہ ان کے نہج وطریقہ کے جو ذرا بھی خلاف کرے تو اصحابِ زیغ وضلال قرار پائے۔ وآمنوا کما آمن الناس۔البقرة/۱۳ (تم بھی ایسا ایمان لاؤ جیسا ایمان اور لوگ (صحابہ) لائے ہیں) ان کی بشری غلطیوں کو اللہ نے معاف کر کے ''رضوان'' دستاویز رضا اور خوشنودی کا پروانہ دے دیا۔ رضی اللہ عنهم ورضوا عنه ذلك الفوز العظيم۔المائدة/۱۱۹ (اللہ تعالی ان سے راضی اور خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں، یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔) اور بندوں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ اس جماعت کو نمونہ وآئیڈیل بناؤ ان کی بشری واجتہادی غلطیوں کے چکر میں پڑ کر اپنا ایمان خراب مت کرو۔ ولا تسبّوا أصحابی ۔متفق

علیہ (تم میرے صحابہ کو برامت کہو) اس زمانۂ پرفتن میں فرقوں و جماعتوں کے آپسی ٹکراؤ کے دور میں حق کے متلاشی کو اپنی سلامتی، ایمان وعقیدہ اور اعمال کی سلامتی مطلوب ہے تو صرف اور صرف ایک ہی راستہ، ایک ہی طریقہ ہے ماأنا علیہ وأصحابی۔ (جس راہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں) ومن یتبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ماتولّی ونصلہ جھنّم۔النساء/۱۱۵۔ (جوشخص مسلمانوں (صحابہ کا راستہ چھوڑ کر دوسرے رستے ہولیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔) یہی وہ ترازو ہے جس سے جماعتوں کو وزن کیا جا سکتا ہے، ان کی گمراہی کی حد کو ریکارڈ کیا جا سکتا ہے، اسی میٹر سے کھرا کھوٹا واضح ہو جاتا ہے، جو جتنا گمراہ وہ اتنا ہی جماعت صحابہ سے دور، جو جتنا حق پر وہ اتنا ہی ان کی عظمت واطاعت کا شیدائی۔

جس قدر ہو ان سے الفت میں کمی
اسی قدر ہے دین و ملت میں کمی
ایک بھی ان سے جو بدخواہ ہو
راہِ حق سے بے شبہ گمراہ ہو
جتنے ہیں اصحابِ پیغمبر تمام
ہے ہر ایک نجمِ ہدایت والسلام

صحابہ کرام امت کے لئے حق وباطل، خیر وشر، سنت وبدعت، ثواب وعقاب کی کسوٹی اور معیار ہیں جو کام انہوں نے کیا وہ حق اور سنت اور باعث ثواب ہے، ان کا ہر قول وفعل ذریعۂ فلاح اور ان کی راہ ترقی وسعادت کی راہ ہے۔

ان کا باطن وقلب تقویٰ سے آراستہ (أولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقویٰ (الحجرات/۳) یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقوی کے لئے خالص کردیا ہے۔) انہیں کے لئے مغفرت، اجر عظیم اور جنت ہے (لھم مغفرۃ وأجر عظیم۔الحجرات/۳۔ان کے لئے بخشش اور بھاری بدلہ ہے) دین کے دشمنوں کے یہ دشمن، دین کے دوستوں کے یہ دوست (أشدّاء علی الکفّار رحماء بینھم۔الفتح/۲۹۔وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں) ہر وقت رضاء الٰہی کی تلاش وجستجو، ان کی زندگی سراپا عبادت واطاعت (تراھم رکّعا سجّدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔الفتح/۲۹۔تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں، اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہیں) ان کے چہرے خدا پرستی کے نور سے تاباں ہیں (سیماھم فی وجوھھم من أثر السجود۔الفتح/۲۹۔ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں) اس وقت سے لیکر قیامت تک انسانوں کے پاس جو خیر ہے، ایمان واسلام، قرآن وحدیث، عبادت ومعاشرت، جنت میں دخول اور جہنم سے نجات کا راستہ، وہ سب صحابہ کرام کی کوششوں کی برکت اور انہی کا صدقہ ہے۔حافظ ذھبیؒ فرماتے ہیں ''اگر وہ نہ ہوتے تو دین کی کوئی اصل یا فرع ہم تک نہ پہنچتی اور ہم کسی سنت یا فرض سے واقف نہ ہوتے اور حضور ﷺ کی احادیث وحالات بھی ہم تک نہ پہونچتے۔

مهاجرین صحابه

شمع رسالت کے وہ پروانے جنہوں نے اللہ اور رسول کے لئے اپنے خویش واقارب، اہل وعیال، مال ودولت ہر چیز کو قربان کر دیا اور کبھی حبشہ کی ہجرت کی اور پھر ہمیشہ کے لئے

مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے اور جب تک مکہ میں رہے کفار کی اذیتوں، آلام ومصائب سے دوچار رہے، سرداران مکہ کے جور وتعدی کا نشانہ بنے رہے اور مسلسل مشق ستم بنے رہے، مکہ کی ریتیلی اور تپتی زمین پر لٹا کر سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا، گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر گھسیٹا جاتا، آگ کے شعلوں پر ڈال کر جلایا جاتا، استہزاء وتمسخر اور گالیوں کی بوچھار کی جاتی، بعض خواتین کے پوشیدہ ونازک مقام پر تیر کا نشانہ لگایا جاتا، اور خدا ورسول کے انکار پر مجبور کیا جاتا، شعبِ اَبی طالب میں قید کر کے دانہ دانہ کو، پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترسا دیا گیا۔ لیکن صبر وتحمل کے یہ پہاڑ ڈٹے رہے اور اَحد کی رٹ لگاتے رہے، آخر اللہ کو ترس آیا اور ہجرت کی اجازت دی تو سب چھوڑ کر چل پڑے،

آخر ان کی غلطی کیا تھی؟ صرف ایک حقیقی صانع وخالق کی وحدانیت کی گواہی، نبی مرسل کی رسالت کا اقرار۔ (الذین أخرجوا من دیارهم بغیر حق الا أن یقولوا ربنا اللہ۔ الحج/ ٤٠۔ جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی سی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے،) اللہ کو یہ لوگ اتنے پسند آئے کہ اللہ نے اپنے پاک کلام میں جا بجا اس کا اظہار فرمایا (للفقراء المهاجرین الذین أخرجوا من دیارهم وأموالهم یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسوله أولئك هم الصادقون۔ الحشر/٨۔ ان حاجتمند مہاجرین کا بالخصوص حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جبراً وظلما جدا کر دیئے گئے وہ اللہ کے فضل یعنی جنت اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے دین کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ایمان کے سچے ہیں۔) (الذین آمنوا وهاجروا فی سبیل اللہ بأموالهم وأنفسهم أعظم درجة عند اللہ وأولئك هم الفائزون یبشرهم ربّهم برحمة منه ورضوان وجنّٰت لهم فیها نعیم مقیم خٰلدین فیها أبداًاِنّ اللہ عنده أجر عظیم۔ التوبة/ ٢٠۔ ٢١۔ ٢٢۔ جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے واسطے انہوں نے ترک وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور جنت کے ایسے باغوں کی کہ ان کے لئے ان باغوں میں دائمی نعمت ہوگی، ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، بلا شبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔) یہی وہ جماعت ہے جو جنت میں سب سے پہلے داخل ہوگی، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا! ! کیا تم جانتے ہو سب سے پہلے کون سی جماعت جنت میں داخل ہوگی؟ وہ مہاجرین فقراء ہیں جو قیامت کے دن جنت کے دروازے پر آئیں گے تو وہ کھلا ہوگا۔ (مسند ابن عمرؓ)

انصاری صحابہ کرامؓ

اسلام کے لئے جان کی قربانی جس قبیلہ نے سب سے زیادہ پیش کی، اور شہادت کا شرفِ بلند جن لوگوں کو سب سے زیادہ حاصل ہوا اور مال کی قربانی اور ایثار کا نمونہ اس فانی دنیا میں جن ہستیوں نے سب سے بڑا پیش کیا، ان کا نام قرآن وحدیث، تاریخ وسیر نے ''انصار'' رکھا۔ امام بخاریؒ نے حضرت قتادہؒ کی شہادت کو نقل کیا ہے کہ ''قبائل عرب میں سے کسی قبیلہ اور قوم کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ اس کے شہیدوں کی تعداد انصار کے شہیدوں سے زیادہ ہو'' حضرت انسؓ کے بیان سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ احد میں

ستر انصار شہید ہوئے بئر معونہ میں ستر انصار شہید ہوئے، جنگ یمامہ میں ستر انصار شہید ہوئے (بخاری)

اللہ کے رسول ﷺ اپنے ان پروانوں اور جانثاروں سے آخری درجہ محبت فرماتے تھے، اوران کا خیال فرماتے تھے، اور ان کے ایمان واعمال پر اعتماد فرماتے تھے، ایک موقعہ پر فرمایا! اگر ہجرت کی اہمیت وفضیلت نہ ہوتی تو میں قبیلہ انصار میں سے ہوتا۔ فرمایا "انصار شعار (قریبی) ہیں اور دوسرے لوگ دثار یعنی ان کے مقابلہ میں کم ہیں" ان کی محبت علامت ایمان اور ان سے بغض علامتِ نفاق قرار پایا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! کمالِ ایمان کی نشانی انصار سے محبت رکھنا ہے، اور نفاق کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے۔ (بخاری ومسلم) انصار کے ایثار وخلوص اور فداکاریوں کے انمٹ نقوش ایسے تاباں ہیں جن کی روشنی اور ضوء فشانی قیامت تک اس بخیل دنیا کو جھنجھوڑتی رہے گی، دنیا ایسے رشتۂ مواخات کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، دو بیوی تھیں تو ایک کو طلاق دے کر دوسرے کو ترجیح دی، ترکہ میں ان کو وارث بنا دیا یہاں تک کہ قرآن نے یہ حکم منسوخ کیا۔ وأولوا الأرحام بعضهم أولیٰ ببعض فی کتاب الله من المومنين والمهاجرين۔الأحزاب/٦۔ (اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں بہ نسبت دوسرے مومنین اور مہاجرین کے) مہمان کی آمد پر اپنے بچوں کو سلا کر مہمانوں کو کھانا کھلانا اور خود بھوکے رہنا، بڑے بڑے قیمتی باغوں کو اور کنوؤں کو نذرِ رسالت کر کے خوشنودئ رب حاصل کرنا کسی اور قوم کی تاریخ نہیں انہیں انصاری صحابہ کی تاریخ ہے۔

اھل بیت

انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهير۔الأحزاب/٣٣۔

اللہ تعالی کو یہ منظور ہے کہ اے گھر والو! تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو ہر طرح (ظاہراً وباطناً) پاک رکھے۔

ان صحابہ میں اللہ تعالی نے اپنے محبوب نبی کے گھرانہ کو خاص مقام عطا فرمایا، ان کی پاکیزگی وصفائی قلب کا تذکرہ فرمایا، آپ نے بھی ان سے خصوصی لگاؤ کا اظہار فرمایا اور لوگوں سے اس کی خواہش کی کہ ان کا خصوصی احترام وخیال رکھیں۔ أذكّركم الله فی أهل بيتی أذكّركم الله فی أهل بيتی (مسلم) (میں تمہیں اللہ کا وہ عذاب یاد دلاتا ہوں جو میرے اہل بیت کے حقوق کی کوتاہی کے سبب ہوگا)

اھل بیت کون ھیں؟

آقا کے خاندان سے جس کو بھی نسبت حاصل ہے بس اس کا احترام لازم ہے حتی کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ جو صرف آپ کے آزاد کردہ غلام تھے لیکن آپ نے ان کو بھی فرد خاندان سمجھا۔ اوران کے سلسلہ میں محبت کی تاکید فرمائی (متفق علیہ)

جو ہیں اہل بیت اور آلِ رسول
گلشنِ دیں کے ہیں سب مقبول پھول

لیکن اصل خاندان یہ چار سلسلے ہیں جن پر آپ کی نسبت کی وجہ سے زکوٰۃ ممنوع ہو گئی۔ (۱) آلِ عباس (۲) آلِ علی (۳) آلِ جعفر (۴) آلِ عقیل۔ ان میں بھی حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ حسنؓ وحسینؓ سے آپ کو زیادہ محبت تھی ان کا نام لے لے کر آپ نے اہلِ بیت کا مصداق قرار دیا (مسلم) ان کی محبت وناراضگی کو اپنی محبت وناراضگی قرار دیا۔

اہل بیت میں آپ کے نسبی گھرانہ بنو ہاشم کے لوگ، اُزواج مطہرات، بناتِ طاہرات دیگر اولادیں بھی شامل ہیں۔قرآن مجید ازواج مطہرات کا خصوصی مقام اور دیگر عورتوں میں ان کے مقام کی بلندی کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے،یٰنسـاء النبیّ لستنّ کـاحـد مـن النسـاء۔الأحزاب/۳۲۔ اے نبی کی بیبیو!تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو۔)

صحابہ کرام میں افضلیت کی ترتیب

تمام صحابہ صفتِ صحابیت میں برابر اور شرفِ صحبتِ رسول سے فیضیاب ہیں، قیامت تک کوئی غیر صحابی ولی کامل، عالم فاضل ان کے پیروں کی دھول کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔لـو أنـفـق مثـل أحـد.....(متفق علیہ)(اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اس کا ثواب میرے صحابہ کے ایک مد کے ثواب کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔)الـصحابة کلهم عدول (تمام صحابہ عادل ہیں)۱۲۰ ہجری تک جو بھی صحابہ کرام زندہ رہے جن کو چند لمحہ بھی بلکہ ایک ہی نظر دیدار رسول حاصل ہو گیا اور خیر البشر کے جمال جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کرلیں تو وہ محبوبیت ومقبولیت کی اس چوٹی کو پہنچ گئے کہ کوئی ولی کامل اس کا تصور نہیں کرسکتا۔مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں''کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، اویس قرنیؒ اپنی تمام تر بلندیٔ شان کے باوجود چونکہ آنحضرت ﷺ کی شرف صحبت سے مشرف نہ ہو سکے اس لئے ادنی صحابی کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکے۔''

لیکن ان میں بھی اللہ نے چند کو ان کے خاص کارناموں، مجاہدوں اور قربانیوں کے نتیجہ میں خاص مقام عطا فرمایا جو ان کو دیگر صحابہ سے ممتاز کرتا ہے، اور دیگر صحابہ بھی اس امتیاز ومقام کا خیال فرماتے تھے، ان کو بڑا سمجھتے، ان کی باتوں کو مانتے اور اہم مسائل میں ان سے رجوع کرتے۔

نکل آئے تھے راہِ امتحاں گاہِ اطاعت میں
مگر موجود تھا فرقِ مراتب اس جماعت میں

اس فرقِ مراتب کی مختصر فہرست یہ ہے:

خلفاء اربعہ۔
عشرۂ مبشرہ۔
جنگ بدر میں شریک صحابہ۔
جنگ احد میں شریک صحابہ۔
بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ۔
وہ انصاری صحابہ جو بیعتِ عقبۂ اولی وثانیہ دونوں میں شریک رہے۔
السابقوں الاولون، وہ صحابہ جن کو دونوں قبلوں کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔
فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے صحابہ کرام

خلفائے اربعہ

اللہ کے رسول ﷺ نے جن صحابہ کرام پر سب سے زیادہ اعتماد کیا اور اپنے کاموں کی ذمہ داری سونپی جو خلافت نبوی کے مظہرِ اتم اور مصداق کامل تھے، اور ان کو جماعتِ صحابہ میں ممتاز مقام حاصل رہا وہ ابوبکر وعمر عثمان وعلی ہیں۔

جہاں میں جو آئینہ دار نبی ہیں
حقیقت میں وہ چار یار نبی ہیں

حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے امام بنایا اور خلافت سونپی (مسلم) قرآن نے بھی حضرت ابوبکر کو آپ کے ساتھ

ذکرفرما کرآپ کی خلافت کی طرف اشارہ کیا۔ثانی اثنین اذ ھما فی الغاراذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔التوبۃ/ ٤٠۔(جبکہ دوآدمیوں میں ایک آپ تھے جس وقت کہ دونوں غار میں تھے جبکہ آپ اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم کچھ غم نہ کرو،یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ہمراہ ہے۔)

حضرت عمرؓ کے کمالات اور خوبیوں کو واضح کرتے ہوئے فرمایا اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔ (ترمذی) حضرت عثمانؓ کا آپ حد سے زیادہ اکرام فرماتے،ایک مرتبہ آپ نے فرمایا عثمانؓ سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں اس لئے میں بھی حیا کرتا ہوں(مسلم)اور فرمایا عثمانؓ جنت میں میرے رفیق ہیں(ترمذی۔ابن ماجہ)ہجرت کی رات جب آپ کے قتل کی سازش مکمل ہوچکی تھی تو آپ کی جگہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے حضرت علیؓ نے مکمل تیاری کرلی تھی،کم عمری ہی میں اسلام کو سینہ سے لگایا اوراس کے پیچ وخم کو دیکھا اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہے،اسی لئے آپ نے فرمایا تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے لئے (متفق علیہ) آپ نے امت کو وصیت فرمائی،علیؓ کو دوست رکھو کیونکہ علیؓ کی دوستی مجھ سے محبت کی پہچان ہے۔(مسلم)

عشرۂ مبشرہ

دنیا کی وہ مبارک وخوش قسمت جماعت اورنفوس قدسیہ جن کے جنتی ہونے کی بشارت زبان فیض ترجمان نے ایک وقت میں نام بنام سنائی،ان کے اسماء یہ ہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا! حضرت ابوبکرؓ جنتی ہیں حضرت عمرؓ جنتی ہیں،حضرت عثمانؓ جنتی ہیں،حضرت علی مرتضیٰؓ جنتی ہیں،حضرت طلحہؓ جنتی ہیں، حضرت زبیر بن عوامؓ جنتی ہیں،حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جنتی ہیں،حضرت سعد بن وقاصؓ جنتی ہیں،حضرت سعید بن زیدؓ جنتی ہیں،حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ جنتی ہیں،رضی اللہ عنھم (ترمذی)

یہ بات قطعی ہے کہ تمام صحابہ جنتی ہیں ،قرآن نے بھی رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ سےاس کی شہادت دی اور آقا نے بھی ارشادفرمایا''اس مسلمان کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھ کو دیکھا ہے،(ترمذی)لیکن عشرۂ مبشرہ کی جماعت کو آقا ﷺ نے خاص مقام دیا اوران کے فضائل بیان فرمائے اوران کے کارنامے وقربانیاں بھی بہت ہیں۔

جنگ بدر واحد میں شریک صحابہ

ایک بھاری فوج ،اسلحہ سے لیس،جنگی آلات ووسائل سے آراستہ ،۱۰۰۰سے زائد گنے چنے بڑے بڑے سردار، جنگ جُو نوجوان ،مانے ہوئے شہسوار،آزمودہ کار سپاہی، ایسے دشمن کے سامنے ایک مختصر جماعت ،ظاہری نگاہ کا یہ فیصلہ کہ یہ ابھی اچک لئے جائیں گے،ان کے بچے یتیم ہو جائیں گے،بیویاں بیوہ ہو جائیں گی،صرف ۳۱۳،جنگی آلات کا کوئی انتظام نہیں صرف دو گھوڑے، ۷۰/اونٹ،جن پر باری باری سواری،واذکروا اذ أنتم قلیل مستضعفون فی الأرض تخافون أن یتخطفکم الناس ۔الأنفال/٢٦۔(اوراس حالت کو یاد کرو جبکہ تم تھوڑے تھے،سرزمین میں کمزورشمار کئے جاتے تھےاوراس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو مخالف لوگ نوچ گھسوٹ نہ لیں) کا سماں تھا۔ایسے حالات میں جان مال کی قربانیاں، جان بچا کر واپس آنے کی کہیں سے کوئی امید نہیں قیامت

تک اسلام کے بقاء کا فیصلہ اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابة لاتعبد بعدھا فی الأرض (اے اللہ اگر تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں اس کے بعد تیری عبادت نہ ہوگی) جنگ احد کے موقع پر آقا کے لئے کسی نے اپنے سینہ کو ڈھال بنایا، کسی نے شہادت میں جنت کی خوشبو محسوس کی، کسی نے یہ اعلان کیا کہ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کیا فائدہ، حضرت حمزہؓ نے لڑتے لڑتے اپنی جان پیش کر دی، حضرت مصعب کو پورا کفن بھی نہ مل سکا، انہیں احد کے شریک صحابہ کے صدق وخلوص، جانثاری وجانبازی کی تعریف قرآن کی زبان میں سنئے۔ من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلاً۔ الأحزاب/۲۳۔ (ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انہوں نے ذرا بھی تغیر وتبدل نہیں کیا۔)

اگر ان قربانیوں، جاں نثاریوں کی قدر نہ ہو اور ہم اس جماعت کے احسان کو بھول جائیں تو پھر اس سے بڑی قربانی اور اس سے عظیم احسان کا تصور کہاں ہوسکتا ہے؟ اور اس سے بڑی احسان فراموشی بھی نہیں ہوسکتی۔ آسمان والے فرشتے بھی ایسوں کی قدر کرتے ہیں، حضرت جبرئیلؑ آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں، اہل بدر کو اپنے درمیان کیسا شمار کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! مسلمانوں میں سب سے افضل، حضرت جبرئیلؑ نے کہا ہمارے درمیان بدر میں شامل ہونے والے فرشتوں کا بھی یہی مقام ہے۔ (بخاری)

اصحاب حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک صحابہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے تمام صحابہ سے بیعت لی کہ اہل مکہ سے مقابلہ کرنا ہے کوئی بھی راہ فرار اختیار نہ کرے گا، اللہ کو یہ بیعت اتنی پسند آئی اور ان کے صدق وخلوص کی ایسی قدر آئی کہ اللہ نے اس بیعت میں شریک تمام صحابہ کا خصوصی تذکرہ فرمایا اور ایک خصوصی ''دستاویز رضا'' عنایت فرمائی، لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونك تحت الشجرة فعلم ما فی قلوبھم وأنزل السکینة علیھم وأثابھم فتحا قریباً۔ الفتح/۱۸۔ (جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔)

ان مقدس ہستیوں کے بارے میں قرآن کریم نے شہادت دی کہ وہ تقویٰ، ایمان، عفت وپاکدامنی کے پیکر ہیں اور ایمان پر استقامت کا ان کو ایسا مقام بلند حاصل ہے کہ ان کے قدم صراط مستقیم سے کسی بھی مرحلہ پر کسی بھی لمحہ نہیں ڈگمگا سکتے، حتی کہ تقوی اور پرہیزگاری کا وصف ان کے لئے لازم ذات بنا دیا گیا۔ وألزمھم کلمة التقوی وکانوا أحق بھا وأھلھا۔ الفتح/۲۶۔ (اور اللہ تعالی نے مسلمانوں کو تقوی پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ اس کے اہل ہیں۔)

عقبۂ اولیٰ وثانیہ میں شریک صحابہ

اس وقت جب کہ اسلام کا ساتھ دینے کے لئے کوئی تیار نہ

تھا،قریش کی ایذا رسانی اور تکلیفوں کی انتہا ہوگئی تھی ،تو اس وقت اللہ نے مکہ سے دور یثرب کے چند اشخاص کو دین کی نصرت وحمایت کے لئے کھڑا کیا جنہوں نے اسلام کے لئے ہر قربانی وجانثاری کو قبول کیا اور یہ اعلان کیا ''جس پر اللہ کے رسول جان دیں گے ہم بھی اسی پر جان دیں گے،جس سے آپ جنگ کریں گے ہم بھی جنگ کریں گے۔

اور حج کے موقع پر پہلے سال ۱۲/افراد نے دوسرے سال ۷۰/افراد نے بیعت کی ،اللہ نے ان کی تعریف فرمائی۔والذین تبووا الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما أوتوا ویوثرون علی أنفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔الحشر/۹۔(اوران لوگوں کا بھی حق ہے جودار الاسلام یعنی مدینہ میں ان مہاجرین کے آنے کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں،جوان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ انصار اپنے دلوں میں کوئی شک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو۔)

السابقون الاولون

(وہ صحابہ جنہوں نے دونوں قبلوں بیت المقدس اور کعبہ کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں)

السابقون الاولون من المھاجرین والأنصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ وأعدّ لھم جنات تجری تحتھا الأنھٰر خٰلدین فیھا أبداً ذٰلك الفوز العظیم ۔التوبۃ/۱۰۰۔(اور جو مہاجرین وانصار ایمان لانے میں سب سے سابق اور مقدم ہیں اور جتنے اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے،)

کسی بھی کام کا ابتدائی مرحلہ دشوار اور کانٹوں پر چلنے اور خون پسینہ ایک کرنے کا ہوتا ہے،اس زمانہ کی کوششیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی لئے اسلام کے ابتداء میں جن صحابہ نے اللہ کے رسول ﷺ کا اور اسلام کا ساتھ دیا ،جان ومال کی قربانیاں دیں ،گھر بار ،اہل وعیال ،وطن وجائیداد کو چھوڑ کر ہجرت کی اور پھر جن صحابہ نے ان کو ٹھکانہ دیا ،ان کی حمایت ونصرت کا اعلان کیا اپنی ہر ہر چیز میں ان کو شریک کیا۔اللہ نے ان کی قدر فرمائی اور ایسے مہاجر وانصاری صحابہ کو جنت میں بلند مقام عنایت فرمایا،حتی کہ دل کے خلوص کے ساتھ جو شخص ان کی پیروی کرے اور ان کے نقش قدم پر چلے وہ بھی محروم نہیں،اس کے لئے بھی جنت کا وعدہ اور خوشخبری ہے۔

فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے صحابہ کرام

لا یستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وٰقتل أولٰئك أعظم درجۃ من الذین أنفقوا من بعد وقاتلوا ۔الحدید/۱۰۔(تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں ،یہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔)

فتح مکہ سے پہلے بڑی تعداد پس وپیش میں تھی اور اسلام کے غلبہ کی منتظر تھی اور جب مکہ فتح ہو گیا اور ہر طرف راستہ صاف ہو

گیا اور اسلام کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمکنے لگا تو فوج درفوج بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوگئی۔اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ أفواجا۔النصر/۱۔۲ ۔(اے محمد! جب خدا کی مدد اور مکہ کی فتح آپہنچے اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں) اب اسلام کے عروج وبلندی اور غلبہ کا دور تھا اب آزمائشیں اور پریشانیاں نہ تھیں اسی لئے اللہ نے اس دور سے پہلے ایمان لانے والوں ،اسلام کی حمایت ونصرت کرنے والوں، جانی ومالی قربانیاں پیش کرنے والوں کو سراہا اور فرمایا، بعد والے صحابہ بھی ان کی برابری نہیں کرسکتے چہ جائیکہ دیگر۔

وہ چار مشہور صحابی جن سے قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا گیا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

قرآن ان چار آدمیوں سے حاصل کرو اور ان سے سیکھو

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالم بن معقلؓ

سید القراء حضرت ابی بن کعبؓ

حضرت معاذ بن جبلؓ (متفق علیہ)

چار حافظ قرآن صحابی

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں جن صحابہ نے پورا قرآن یاد کرلیا تھا اور محفوظ کرلیا تھا وہ چار مشہور ہیں۔

حضرت سید القراء ابی بن کعبؓ

حضرت معاذ بن جبلؓ

حضرت زید بن ثابتؓ

حضرت ابوزیدؓ حضرت انسؓ کے ایک چچا (متفق علیہ)

علمی بزرگی رکھنے والے چار صحابہ

حضرت معاذ بن جبلؓ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ علم چار حضرات سے حاصل کرو

حضرت عویمر ابوالدرداءؓ سے

حضرت سلمان فارسیؓ سے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے

حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے (ترمذی)

وہ تین صحابی جن کی جنت مشتاق ہے

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا! جنت تین لوگوں کی بہت مشتاق ہے

حضرت علیؓ

حضرت عمارؓ

حضرت سلمانؓ (ترمذی)

چار صحابہ کے خصوصی اتباع کی تاکید

آپ ﷺ نے فرمایا! تم میرے بعد میرے اصحاب میں سے ابوبکرؓ وعمرؓ کی پیروی کرو اور عمار بن یاسرؓ کی سیرت اور ان کی روش پر چلو اور ام عبد عبداللہ بن مسعودؓ کے عہد یعنی قول ووصیت کو مضبوط پکڑو (ترمذی)

چار صحابہ سے خصوصی محبت رکھنے کی تاکید

رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا! اللہ نے مجھ کو چار آدمیوں سے خاص محبت رکھنے کا حکم دیا اور یہ بتایا کہ وہ ان چاروں سے محبت رکھتا ہے۔صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں بھی ان چاروں کے نام بتا دیجئے۔آپ نے ارشاد فرمایا! ان میں سے

ایک علیؓ ہیں (تین مرتبہ فرمایا) ایک ابو ذرؓ ہیں، ایک مقدادؓ اور ایک سلمانؓ ہیں۔ (ترمذی)

سات اچھے صحابہ

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک مجلس میں نام بنام سات صحابہ کی تعریف فرمائی۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا!

ابوبکرؓ بہت اچھے آدمی ہیں

عمرؓ بہت اچھے آدمی ہیں

ابوعبیدہ بن جرّاحؓ بہت اچھے آدمی ہیں

اسید بن حضیرؓ بہت اچھے آدمی ہیں

ثابت بن قیسؓ بہت اچھے آدمی ہیں

معاد بن جبلؓ بہت اچھے آدمی ہیں

معاذ بن عمرو بن الجموحؓ بہت اچھے آدمی ہیں (ترمذی)

عبد الله نامی چار صحابی

صحابہ کرام میں بڑی تعداد ہے جو عبد اللہ کے نام سے موسوم ہیں اور کئی ان میں سے بہت مشہور بھی ہیں جیسے عبداللہ بن مسعودؓ، لیکن محدثین نے ''عبادلہ'' کے نام سے جن چار صحابہ کو موسوم کیا اور ان کو اس فہرست میں شامل کیا وہ یہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

سیرت نبوی پر ایک فلم

سیرت نبوی پر فلم جس میں سیرت کے ابتدائی ادوار اور جنگ بدر واحد کا نقشہ تمثیلی شکل میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے، جس کو اہل اسلام بڑے شوق کے ساتھ دیکھتے ہیں، اور اس میں یقیناً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بڑی معلومات ہیں، لیکن اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس کے مضر اثرات بھی بہت سنگین اور خطرناک ہیں جو بسا اوقات ایمان سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس میں حضرت حمزہؓ کا رول و کردار دلوں کو گرماتا اور خوش کرتا ہے اور انسان کی زبان سے رضی اللہ عنہ کی صدا بلند ہوتی ہے، تو ان کے مقابلہ میں فلم دیکھنے والا حضرت ہندہؓ کو گالیاں دیتا، دل میں ان کے خلاف بغض ونفرت لیکر اٹھتا ہے، ان کو رقص کرتے اور بے حیائی کرتے دیکھتا ہے، اللہ اکبر! ایک صحابیہ جن کو آقا نے معاف کر کے ان کا اسلام قبول کر لیا، ہم ان کو اس نگاہ سے دیکھیں .....العیاذ باللہ۔ یہ وہ مرحلہ ہے جو قابلِ تشویش ہے، دوسری طرف حضرت علیؓ کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ بھی محلّ نظر ہے غیر شرعی چہرہ، اور ان مقامات پر جہاں آقائے دوعالم کا رول ہو، گویا محمد ﷺ کی جگہ علیؓ کو کر دیا گیا ہے اور علیؓ کی شکل میں محمد ﷺ ہیں، یہ رول بھی حلول اور تشیع کے عقیدہ تک پہونچاتا ہے، بعض اکابر صحابہ جن کو اس فلم میں اہمیت حاصل ہونی چاہئے تھی کہیں نظر ہی نہیں آتے، اور ان کا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہ فلم شہد میں زہر پیش کئے جانے کے مرادف ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔ یہ وضاحت بھی مفید ہوگی کہ تمثیلی پروگرام مغرب کی دین ہے اس میں فائدے کم اور نقصان زیادہ ہیں۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

بدعات وخرافات

مولانا کلیم اللہ عمری مدنی

اسلام دین کامل اور ایک مکمل ضابطہء حیات ہے۔سورۃ المائدہ میں اللہ نے فرمایا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:۳): آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔

اسلامی تعلیمات آسان ، عام فہم اور واضح ہیں، جو خرافات اور فلسفیانہ خیالات ومعتقدات سے پاک ہیں یہ دین ہر حیثیت سے مکمل اور مبنی برفطرت ہے،اس میں کسی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔نہ عقائد وعبادات میں اور نہ ہی معاملات واخلاقیات میں۔

اسلام ایک نظام زندگی سے پہلے عقیدے کی درستگی کا نام ہے، رسول اکرم ﷺ نے مکہ کے تیرہ سالہ عرصے میں اپنی تمام تر توجہ اصلاح عقیدہ پر صرف فرمائی اور مدنی دور میں اسلامی حکومت کا نظام وضع فرمایا۔اس دین میں ہر قسم کی گمراہی اور خرافات واوہام کو ضلالت وگمراہی قرار دیا،قرون اولی میں مسلمان خالص دین پر قائم تھے،اس لئے اس کی برکتیں انہیں حاصل تھیں آج مسلمان زوال و ادبار سے دوچار ہیں تو اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ بدعات و خرافات میں کھو چکے ہیں۔

ذیل میں بدعات کی حقیقت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

بدعت کی تعریف : لفظ بدعت "بدع" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے " کسی چیز کو ایسے طریقے پر ایجاد کرنا جس کی کوئی مثال سابق میں نہ ہو "اللہ کا ارشاد ہے قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُل (الاحقاف:۹) آپ کہہ دیجیے! کہ میں کوئی بالکل انوکھا پیغمبر نہیں۔یعنی مجھ سے پہلے متعدد رسول آچکے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں کسی ایسی چیز کے ایجاد کرنے کو بدعت کہتے ہیں جس کا تعلق کتاب وسنت سے نہ ہو۔امام شاطبیؒ فرماتے ہیں: **هی الطريقة المخترعةفی الدين تضاهی الشريعة يقصد بها التقرب الی الله ولم يقم علی صحتها دليل اصلاو و صفا** (الاعتصام للشاطبی:۱/۳۷)

بدعت کا حکم : دین میں بدعت کا ایجاد حرام ہے، رسول اکرمﷺ نے فرمایا:**من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو رد**(بخاری و مسلم) جس کسی نے ہمارے دین میں کسی نئی چیز کوایجاد کیا جو دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

دین میں ہر بدعت حرام ہے کیوں کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جھنم تک لے جاتی ہے، بدعت کو "بدعت حسنہ "اور" بدعت سیئہ "میں تقسیم کرنا اور بدعت حسنہ کو جائزٹھہرالینا صحیح نہیں ہے اور یہ تقسیم نہ رسول اکرمﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابہ کرامؓ اس تقسیم کے قائل تھے،

بعض لوگوں کا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ بدعت کی تقسیم حضرت عمرؓ کی فرمائی ہوئی ہے ۔حضرت عمرؓ نے نماز تراویح باجماعت قائم کرنے کے بعد فرمایا تھا:**نعمت البدعة ھذہ** ۔ یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے،اس کا یہ مطلب غلط ہے کہ نماز تراویح با جماعت بدعت حسنہ ہے کیوں کہ بدعت شرعی اصطلاح میں ہر اس کام کو کہیں گے دین میں جس کی کوئی اصل نہ ہو، جب کہ تراویح کی اصل موجود ہے، رسول اکرمﷺ نے صحابہ کرامؓ کو چند راتیں نماز تراویح باجماعت پڑھائی تھی ۔تسلسل کو رسول اکرمﷺ نے محض فرضیت کے خوف سے باقی نہیں رکھا ۔رسول اکرمﷺ کی وفات کے بعد جب یہ خوف ختم ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے نماز تراویح کو باجماعت قائم کرنے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا۔آپؓ کا فرمان:**نعمت البدعة ھذہ:** کا مقصود جماعت تراویح کے سلسلے میں یہ تعریف کرنا تھا کہ جماعت تراویح کا قیام کیا ہی اچھی شروعات ہے۔

بدعت کی مذمت :قرآن کریم میں کئی ایک آیات میں بدعت کی مذمت کی گئی ہے ۔ارشاد ربانی ہے :**وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (الروم:۳۱،۳۲)اور مشرکین میں سے نہ ہوجاؤ ،اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کردیا اور خود بھی گروہ گروہ ہو گئے ۔ ہر گروہ اس چیز میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے:

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرمﷺ نے فرمایا: مذکورہ آیت میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے،ان سے مراد اہل بدعت ہیں(الاعتصام:۱/۶۵)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا (الکہف:۱۰۳)اے نبیﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں بتادوں کہ اعمال کے حساب سے سب سے زیادہ خسارہ میں کون ہیں:

حضرت علیؓ اور حضرت سفیانؒ کا بیان ہے کہ آیت میں خسارہ اٹھانے والوں سے مراد اہل بدعت ہیں (الاعتصام:۱/۶۵)

احادیث میں بیشمار جگہ بدعت کی شناعت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر بدعت صریح گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے جیسا کہ خطبہءمسنونہ میں رسول اکرمﷺ سے مروی ہے۔

بدعت صحابہ کرامؓ کی نظر میں: تمام صحابہ

کرامؓ، تابعینؒ عظام اور ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ بدعت ایک بدترین چیز ہے۔

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: **اتبعوا ولاتتبعوا فقد كفيتم ، كل بدعة ضلالة** (سنن الدارمی :۶۹/۱، مجمع الزوائد للھیثمی ۱۸۱/۱) سنت کی پیروی کرو اور بدعت کی ایجاد نہ کرو، تم بدعت سے بچا لیے گئے ہو، ہر بدعت گمراہی ہے،

☆ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا: **كل بدعة ضلالة وان رآها الناس حسنة** (المدخل للبیھقی ۔ص:۱۹۱، والدارمی باسناد صحیح) ہر بدعت گمراہی ہے اگر چیکہ لوگ اسے اچھا سمجھیں:

☆ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فرمان ہے: **ان ابغض الامور الى الله البدع** (للبیھقی :۳۱۶/۴) بے شک اللہ کے پاس ناپسندیدہ اعمال میں سے بدعات ہیں۔

☆ حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا ہے: **من ابتدع فى الاسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم ان محمد خان الرسالة لان الله يقول :اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى ورضيت لكم الاسلام دينا** ۔: جس نے دین اسلام میں کسی بدعت کو ایجاد کیا ہے، جسے وہ اچھا سمجھتا ہو تو یقیناً اس نے یہ گمان کیا کہ محمد ﷺ نے اپنی رسالت میں خیانت فرمائی، اس لئے کہ فرمان خداوندی ہے؛ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا (طبقات :۲۴۱/۱)

☆ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا: ہمارے نزدیک سنت کے اصول یہ ہیں کہ جس بات پر صحابہ کرام قائم تھے اسے مضبوطی کے ساتھ تھاما جائے اور ان صحابہ کی اقتداء کریں اور بدعت و خرافات سے کلی طور پر دور رہا جائے اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

☆ حضرت علقمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے: **اذا التمست الدنيا بعمل الآخرة و نفقة لغير الدين ظهرت البدع** (۔۔۔۔) : جب عمل آخرت کے ذریعہ دنیا طلب کی جائے اور دین کے علاوہ کسی اور مقصد کے تحت خرچ کیا جائے تو بدعتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

بدعتوں کا ظہور: امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: عام بدعتیں جن کا تعلق علوم و عبادات سے ہے، یہ خلفائے راشدین کے آخری زمانے میں رونما ہوئیں جیسے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ خبر دی ہے: **من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتى و سنة الخلفاء الراشدين من بعدى** (مجموع الفتاوی:۳۵۴/۰۱): تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھیں گے، تو تم لوگ میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑ لو اور اس پر جمے رہو۔

سب سے پہلے انکار تقدیر، انکارِ عمل، تشیع اور خوارج کی بدعتیں ظاہر ہوئیں، ان کا ظہور دوسری صدی ہجری میں ہوا۔

اسبابِ بدعت :

☆ **قرآن کریم کے معانی ومطالب سے ناواقفیت**: قرآن فہمی سے دوری اور سنتِ رسول ﷺ کا صحیح علم نہ ہونا بلکہ دینی

احکام سے لاعلمی اور جہالت کا ظہور بدعات کا بنیادی سبب ہے قرآن و حدیث پر مضبوطی سے جمے رہنے سے بدعت سے نجات ملتی ہے اللہ کا ارشاد ہے: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (انعام:۱۵۳) یہی میرا سیدھا راستہ ہے، اسی کی پیروی کرو اور دیگر راستوں کی پیروی نہ کرنا جو تمہیں اس کے راستے سے جدا کردے۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس کے دائیں اور بائیں چند لکیریں کھنچیں اور فرمایا کہ یہ بہت سارے راستے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اپنی جانب بلا رہا ہے، پھر نبی کریم ﷺ نے مذکورہ آیت تلاوت کی (مسند احمد)

☆سنتِ رسول ﷺ میں صحیح، ضعیف اور موضوع احادیث کے درمیان تمیز نہ کرنا: یہ بھی ظہور بدعت کا ایک اہم سبب ہے اس کا صحیح علم نہ ہونا بھی ایک ذریعہ ہے جیسا کہ دعا میں نبی کریم ﷺ سے توسل کا دارومدار حضرت آدمؑ سے منسوب واقعے پر مشتمل ایک موضوع حدیث پر منحصر ہے جسے امام حاکم نے روایت کیا ہے اسی طرح نورِ محمدی کا مسئلہ ایک موضوع اور من گھڑت حدیث سے ماخوذ ہے، جس میں اللہ کے رسول کی طرف یہ فرمان منسوب ہے: **اول ما خلق اللہ نور نبیک یاجابر** (البدعة واثرها السئي على الامة:٤٧) اے جابر: اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی کے نور کو پیدا کیا:

☆خواہشات کی پیروی: بدعات کی ایک وجہ نفسانی خواہشات کی پیروی بھی ہے جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے: فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص:۵۰): اگر یہ تیری بات نہ مانیں تو آپ یقین کرلیں کہ یہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں اور اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہو بغیر اللہ کی رہنمائی کے۔

لوگ دین کے معاملے میں ایسے ہی نادانوں کے پیچھے چلتے ہیں جو ان کی مرضی کے مطابق مسائل بتاتے اور فتوی دیتے ہیں، اور یہی نادان عالم وفاضل کی شکل میں لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا: یقیناً قیامت کی علامت میں سے ایک یہ ہے کہ علم کو اصاغر کے پاس تلاش کیا جائے گا (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ:۱۱۸) حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: اس حدیث میں اصاغر سے مراد اہل بدعت ہیں اور عام اہل بدعت علم سے کورے ہوتے ہیں، جو خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

☆آباء واجداد کی اندھی پیروی: معاشرے میں بدعت کو رائج کرنے میں آباء واجداد کی اندھی پیروی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے، ایسے لوگ قرآن و حدیث کے برخلاف اسلاف کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور اپنے مشائخ کو معصوم جاننا اور ان سے بیجا عقیدت ومحبت بھی ایک اہم سبب ہے، شریعت پر عقل کو ترجیح دینا، عقل انسانی کو حسن و

خوبی میں اور شرعی امور میں کتاب وسنت پر ترجیح دینا اور عقل کی بنیاد پر فیصلے کرنا بھی بدعات کے پھیلنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

بدعت کے اثرات : بدعت، سنت کو ختم کر دیتی ہے اس لئے بدعت اور سنت ایک جگہ جمع ہو نہیں سکتے، جیسا کہ مشہور تابعی حسان بن عطیہؒ نے فرمایا: **ماابتدع قوم بدعة فی دینهم الا نزع الله من سننهم مثلها لا یعیدها الیهم الی یوم القیامة** (البدعۃ واثرھا السیئ علی الامۃ: ۱۷): جب کوئی قوم اپنے دین میں کسی بدعت کو جگہ دیتی ہے تو اللہ اس کے مثل ایک سنت کو اٹھالیتا ہے جو قیامت تک دوبارہ نہیں لوٹائے گا:

☆ بدعت، امت کی ہلاکت کا ذریعہ ہے جیسا کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا: اگر تم لوگ نبی کی سنت کو ترک کروگے تو گمراہ ہوجاؤ گے۔

☆ بدعت کفر تک پہنچانے والی چیز ہے اس لئے کہ بدعتی اپنے لئے ایک ایسے طریقے کو قبول کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے جو کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا طریقہ امت مسلمہ کے طریقے سے زیادہ درست ہے۔

☆ بدعتی کا عمل مردود ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ ایسے اعمال کو ہی قبول کرتا ہے جو اخلاص پر مبنی ہوں اور سنت کے موافق ہوں۔

☆ بدعتی کو توبہ کی توفیق ہی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ بدعت کو ثواب خیال کرکے اختیار کرتا ہے بلکہ اس کے حق میں سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے، رسول ﷺ نے فرمایا: **ان اللہ حجب التوبة من کل صاحب بدعة حتی یدع بدعته** (الطبرانی فی المعجم الاوسط: ۶۲/۸، رقم الحدیث: ۴۷۱۳): اللہ بدعتی سے توبہ کی توفیق روک لیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی بدعت سے باز آجائے۔

☆ بدعتی حوض کوثر سے دھتکارا جائیگا، اور رسول ﷺ کی سفارش سے محروم کردیا جائے گا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ فرشتے روز قیامت ان لوگوں کو آب کوثر سے سیراب نہیں ہونے دیں گے جنہوں نے بدعات کو گلے لگایا (بخاری ومسلم)

☆ بدعت ایجاد کرنے والا خود گمراہ ہوتا ہے اور جو لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں انہیں بھی گمراہ کرکے ان سب کا گناہ بھی اپنے سر لیتا ہے، ارشاد باری ہے: لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (النحل: ۲۵): اسی کا نتیجہ ہوگا کہ قیامت کے دن یہ لوگ اپنے پورے بوجھ کے ساتھ ہی ان کے بوجھ کے بھی حصہ دار ہوں گے جنہیں بے علمی سے گمراہ کرتے رہے۔

☆ بدعتی رسول ﷺ کی زبانی ملعون ہے: **من احدث فیها او آوی محدثا فعلیه لعنة الله و الملائکة والناس اجمعین** (مسلم) جو شخص بدعت ایجاد کرنے والا ہے یا کسی بدعتی کو پناہ دیتا ہے اس پر اللہ کی، اس کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

نکاح ایک عبادت

محمد شعیب ندوی مدرسہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ پرتاپگڑھ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے مرد کو حضرت آدمؑ کے روپ میں پیدا فرمایا، پھر حضرت حوّا کو حضرت آدمؑ کی تنہائی ووحشت دور کرنے کی غرض سے پیدا فرمایا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ خالقِ کائنات نے عورت کو مرد کے لئے سکون وراحت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا،

ارشاد خداوندی ہے، ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا﴾ (الأعراف ۱۸۹) ''وہی ہے جس نے تم کو ایک ہستی سے پیدا کیا اور اسی سے اسکا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے''

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَمِنْ آيٰتِهٖ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (الروم ۲۱)

''اسکی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہیں سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کی'

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی بقا کیلئے زوجیت کا ایک انمول اور نہایت پاکیزہ وصاف ستھرا قانون جاری فرمایا، خالق کائنات نے زوجیت کا یہ قانون صرف انسانوں میں نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز میں نافذ فرما رکھا ہے، چنانچہ اس نے جس طرح انسانوں کو مرد وعورت کے روپ میں جوڑے جوڑے بنا کر وجود بخشا، اسی طرح اس نے حیوانات ونباتات کے بھی جوڑے بنائے ہیں، جیسا کہ قرآن اعلان کرتا ہے،

﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الذّاریات ۴۹)

''اور ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا تا کہ تم نصیحت حاصل کرو''

الغرض اس کائنات کی بنیاد قانونِ زوجیت پر ہے، جس کے باعث زندگی اور اسکے مظاہر رواں دواں ہیں، زوجیت میں بنیادی عنصر کشش واتصال ہے، اور اسی کے ساتھ اس نے ایک دوسرے کو لبھانے اور دوسرے کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے انھیں حسن وخوبصورتی سے بھی نوازا، اسی قانونِ زوجیت کی بنیاد پر دنیا اور اسکا نظام جاری ہے، اگر قانونِ زوجیت نہ ہوتا تو پھر یہ کارخانۂ فطرت قائم نہ رہتا، حاصل یہ کہ اس کارخانۂ حیات کو جاری رکھنے کے لئے زوجیت یا ازدواجی زندگی کا تسلسل ضروری ہے، خواہ وہ عالمِ نباتات وحیوانات ہو یا

عالمِ انسانی، چونکہ انسان اس کائنات میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی سے اس کائنات کی رونق قائم ہے، انسان نہ ہوتا تو یہ بزم سونی سونی ہوتی، ارشاد ہے

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾(بنی اسرائیل ۷۰)

''اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی''

چونکہ انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی گئی ہے اسی لئے قانون ازدواج کے طور طریقوں میں دیگر مخلوقات اور انسانوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، دیگر جتنی مخلوقات ہیں خالقِ کائنات نے انکے ازدواجی تعلقات کے لئے جو طریقے انکی فطرت میں ودیعت فرما دیئے ہیں وہ اسی طرح سے جاری وساری ہیں، کیونکہ ان پر کوئی اخلاقی وقانونی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، لیکن چونکہ انسان صرف حیوان نہیں ہے بلکہ اسکے خمیر میں حیوانی صفات کے ساتھ ملکوتی یعنی فرشتوں کی صفات بھی رکھی گئیں ہیں۔ لہٰذا انسان اگر ایک لحاظ سے حیوان ہے تو دوسرے لحاظ سے فرشتہ بھی ہے، جب اس کی ملکوتی صفات یعنی فرشتوں والی خصلت پر حیوانی خصلت غالب آجاتی ہے تو وہ نرا جانور بن جاتا ہے، اور جب فرشتوں والی خصلت اس پر غالب آجاتی ہے تو وہی انسان رشکِ ملائک بنکر کائنات کو گل وگلزار بنا دیتا ہے، چنانچہ انسانوں سے اسی بات کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور انبیاء کرام کی دعوت کا خلاصہ بھی یہی کہ وہ انسان کو حیوانی جذبات پر قابو پانے اور ملکوتی جذبات کو ابھارنے اور اسکو غالب رکھنے کی پوری کوشش کریں۔

اسلام میں مرد وعورت کا مقام :

اسلام کی نظر میں مرد وعورت دونوں انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مردوں کو اللہ نے عورتوں پر فضیلت بخشی ہے چنانچہ ارشاد ہے، ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (النّساء ۳٤)

''مرد عورتوں کے نگراں اور سربراہ ہیں، کیونکہ قدرتی طور پر اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے، اور اس لئے بھی کہ مرد ہی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں اور ان کے اخراجات برداشت کرتے ہیں''

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾(البقرۃ ۲۲۸)

''مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے''

اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کو'' ناقصاتُ عقلٍ ودینٍ'' فرمایا کہ عقل اور دین دونوں میں ناقص ہوتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ مساوات مرد وزن کے اس پرفریب دور میں لوگوں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے جسکا اظہار زندگی کے ہر شعبہ میں ہر وقت ہوتا ہے، جسکی تائید ماہرین نفسیات کے اقوال سے بھی ہوتی ہے،

چنانچہ دائرۃ المعارف الکبریٰ لقرن التاسع عشر (انسائیکلوپیڈیا) میں لکھا ہے کہ

''عورت جسمانی طور پر ۱÷۳ کے بقدر مرد سے کمزور ہوتی ہے، اور اسکی حرکات میں بھی چستی وتوازن کی کمی ہوتی ہے، انکا دل بھی جو زندگی کا مرکز ہے ۶۰ گرام کے بقدر مرد سے چھوٹا اور ہلکا ہوتا ہے، اور اسکے سانس کا نظام بھی مرد سے کمزور ہوتا ہے، اور

حرارت بھی کم ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مرد کی ایک گھنٹہ میں ۱۱رگرام حرارت غزیری کم ہوتی ہے، اورعورت کی ۶رگرام سے کچھ زائد ،(دائرۃ المعارف فرید وجدی ۵۹۹۔۶۰۰۔معاشرتی مسائل ازمولانا برہان الدین سنبھلی ۱۳۰)

مساوات مردوزن کا پر فریب نعرہ

اس اعتبار سے مرد اورعورت کی فطرت میں بہت فرق رکھا گیا ہے،اور یہ فرق مرد اورعورت کی خلقی وجسمانی ساخت کے ایک ایک عضو سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ ہرعورت پر ہر ماہ چند دن ایسے ضرور گزرتے ہیں،جس میں اسکو حیض آتا ہے ان ایام میں اکثر عورتیں مختلف تکلیفوں سے گزرتی ہیں ،اس کے بعد حمل کے ایام میں بھی وہ طرح طرح کی بیماریوں اور تکلیفوں سے دوچار رہتی ہیں،جس میں وہ کسی اہم ذمہ داری کو سنبھالنے کے لائق نہیں رہتی ہیں ،اسکے بعد دودھ پلانے اور بچوں کی تربیت اورانکی پرورش کا مرحلہ سب سے زیادہ نازک اوراہم ہوتا ہے،اب اسکے بالمقابل مردوں کی حالت پرغور کیا جائے تو اس پہلو سے ان پر کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی ہے، بلکہ اسکو ان تمام جھمیلوں سے آزاد رکھا گیا ہے،تاکہ مرد گھر کے باہر کی ذمہ داریوں کو انجام دے،اورعورت اندرون خانہ رہکر گھر کی نگہداشت کرے،اب کیا اس سے بڑا ظلم کوئی ہوسکتا ہے کہ جس نرم ونازک عورت پر اتنی ساری ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں اسی سے اس بات کا بھی مطالبہ کیا جائے کہ تو ولادت کی تکلیفیں بھی جھیل اور بچوں کی پرورش کا بار بھی سنبھال اور باہر میدان عمل میں آکر مردوں کے برابر ہر کام میں شریک ہو، یہ عدل نہیں ظلم ہے، اس سے بڑا عورتوں پر کوئی ظلم نہیں ہوسکتا ہے،اور یہ عورت کیلئے کوئی شرم وحیااورندامت وشرمندگی کا پہلو نہیں ہے بلکہ تمدن کی ترقی کیلئے یہ ضروری ہے،اسی لئے خالق فطرت نے مرد وعورت کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ قدرت نے دونوں میں بدرجہ اتم پیدا کی ہیں ،اور جب تک اعتدال وتوازن کے ساتھ دونوں اپنی اپنی صلاحتیں بروئے کار لاتے رہیں گے،انسانی تمدن ترقی کے مدارج طے کرتا رہے گا اور جہاں اس فطری قانون سے بغاوت کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ قانون فطرت کو توڑا نہیں جاسکتا،البتہ نظام معاشرت خود بخود بکھر کر رہ جائیگا،جیسا کہ آج پوری دنیا پر بالخصوص مغربی دنیا پر گہری نظر ڈالنے سے پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،اس لئے فطرت سے بغاوت صریح حماقت وبے وقوفی ہے بلکہ فطرت نے جس میں جو صلاحیت رکھی ہے اسکو پروان چڑھانا ہی اسکی عزت ونیک نامی کا باعث ہے،عورتیں اگر مرد بننا چاہیں تو یہ کبھی نہیں ہوسکتا ہے ،عورت عورت ہی رہے گی چاہے جتنی تدبیریں کرلی جائیں ،اسی طرح مرد چاہے جتنا سر مار لیں تو وہ ماں نہیں بن سکتے اس لئے عقل ودانش کی بات یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے جو صلاحتیں اللہ نے جس صنف میں رکھی ہیں انہیں کی حفاظت کی جائے ، بلکہ ان کو پروان چڑھایا جائے، ورنہ بڑے خطرناک نتائج رونما ہوں گے۔

اسلام کی شان اعجاز

اسی لئے اسلام نے عورتوں اور مردوں کے حدود متعین کر دئے ہیں،اور ہرایک کی ذمہ داری تقسیم فرمادی ہے،تاکہ انسان اندھیروں میں بھٹکتا نہ رہے، بلکہ اسلام نے ہرایک کا فرض منصبی طے فرمادیا ہے،اوراسکے لئے اس نے نکاح کا پاکیزہ اورمقدس رشتہ قائم فرمایا ،تاکہ انسان افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے

محفوظ رہے اور نسل انسانی کا تسلسل برقرار رہے۔

اسلام افراط وتفریط سے پاک

اسلام میں نکاح ایک پاکیزہ اور مقدس رشتہ ہے لیکن دوسری قوموں میں اس سلسلہ میں بڑی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ بعض قوموں میں مثلاً عیسائیوں میں رہبانیت اور تجرد کی (بن بیاہی) زندگی ہی روحانی ترقی کا زینہ ہے، اسکے بغیر انسان خدا کا قرب حاصل کر ہی نہیں سکتا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے عورت کو شیطان کا ایجنٹ اور قابل نفرت اور ایک گھناونا وجود قرار دیا، اور ہندوؤں کے یہاں شادی کے بعد عورت کو ایسا جکڑ دیا جاتا ہے کہ اسکے سارے اختیارات ختم ہو جاتے ہیں، اب اسکی حیثیت سوائے لونڈی کے اور کچھ نہیں رہ جاتی۔ دوسری طرف مغرب کا گھناؤنا ماحول ہے جہاں نکاح کے تقدس اور اسکے اصولوں سے انکو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے، جہاں جی چاہا منھ مارا اور چلتے بنے، یہ صرف اسلام کی خوبی اور اسکا کمال ہے کہ اس نے نکاح کے اندر ایسا اعتدال اور توازن رکھا ہے کہ خاندان کی تشکیل اسکے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، اسمیں انسان کے مزاج اور نفسیات کی جو رعایت رکھی ہے، انسانوں کے وضع کئے ہوئے قوانین اسکا تصور بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ اس قانون کو بنانے والا وہی ہے جس نے اس نظام کائنات کو نہایت حسین وجمیل اور توازن واعتدال کے ساتھ بنایا، اسی لئے اسکے ہر قانون میں وہی شانِ یکتائی نظر آئے گی، ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾(الملك/١٤)

اسی لئے اسلام نے انسان کے جنسی میلان اور شہوانی جذبات کو کچلنے اور فنا کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس سے سختی کے ساتھ منع کیا بلکہ اس کو صحیح موقع ومحل میں استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔

اسلام میں شادی کا مقصد

اسلام میں شادی کا مقصد صرف لذت اندوزی نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ اسکا مقصد یہ ہے کہ مرد وعورت کی زندگی خوشگوار گزرے، خاندانی نظام مستحکم وپائیدار ہو، خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لئے اپنی نسل کو جاری رکھیں، اسی لئے قرآن پاک کے اندر مرد وعورت کے تعلقات کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ ایک معجزانہ اور حکمتوں سے بھری تعبیر ہے، جہاں عقل انسانی کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی، چنانچہ قرآن کہتا ہے،

﴿نِسَائُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ (البقرة/٢٢٣) ''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں''

عورت اور مرد کو کھیتی سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں کا معاملہ دوسری مخلوقات سے بالکل جداگانہ ہے، اس لئے مرد وعورت کے تعلقات میں وہ پائداری اور مضبوطی ہونی چاہئے جو کسان اور کھیت میں ہوتی ہے، کسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ کھیت میں جا کر بیج پھینک کر چلا آئے بلکہ اسکے ذمہ یہ ہے کہ بیج ڈالنے کے بعد برابر اسکی دیکھ بھال کرتا رہے، اسکے لئے کھاد اور پانی کا پورا انتظام کرے اور اسکی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے کہ چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور ایک خودرو درخت اگا دے بلکہ اسکی ذمہ داری یہ ہے کہ جب اس عورت سے نکاح کرے تو اخیر دم تک اسکا پورا بار سنبھالے، دوسری جگہ قرآن مجید میں اس تعلق کی کیسی حسین اور نازک تعبیر ذکر کی گئی ہے، ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾(البقرة١٨٧) ''وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو''

اس میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ مرد وعورت کا تعلق محض شہوانی جذبات کی تسکین کے لئے نہ ہو بلکہ ان میں آپس میں انس ولگاؤ، الفت ومحبت ہو، وہ آپس میں ایک دوسرے کے راز دار اور رنج وغم، راحت وآرام اور زندگی کے نشیب وفراز میں ایک دوسرے کے شریک اور جیون ساتھی ہوں، اور انکے درمیان ایسی محبت اور دائمی وابستگی ہو جیسے لباس اور جسم میں ہوتی ہے، اور یہی خاندانی نظام انسانی معاشرہ کا سنگِ بنیاد ہے، اگر ازدواجی زندگی میں یہ روح نہیں ہے تو گویا وہ ایک بے جان لاش ہے۔

چنانچہ اس قانونِ ازدواج کا سب سے عظیم مقصد اخلاق اور عفت کی حفاظت ہے، اسی لئے قرآن پاک میں نکاح کو احصان سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے، ﴿ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ﴾(النساء ٢٤) 'یہ عورتیں جو تم پر حرام کی گئیں انکے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کی گئی ہیں، بشرطیکہ شہوت رانی کیلئے نہیں بلکہ قید نکاح میں لانے کیلئے تم اپنے اموال کے بدلے میں انکو حاصل کرنا چاہو''

اور عورتوں کے لئے'' مُحْصَنٰت '' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،'' حِصْن '' قلعہ کو کہتے ہیں،'' احصان '' کے معنیٰ '' قلع بندی'' کے ہیں، جو مرد نکاح کرتا ہے وہ "مُحْصِن" ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے، جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ'' محصنة'' ہے، یعنی وہ اس قلعہ کی حفاظت میں آ گئی ، جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اسکے اخلاق اور عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے، یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے، زوجین کو نکاح کی قید میں اس لئے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطری خواہشات پوری کریں، اور یہ مقصد اتنا اہم اور عظیم ہے کہ جہاں ازدواجی تعلقات میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو اور اخلاق وعصمت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو وہاں اس متاعِ گرانمایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کھولدینا ضروری ہے۔

نکاح انبیاء کرام کی سنت

اسی لئے نکاح کو انبیاء کرام کی سنت قرار دیا گیا ہے، اسکی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں صراحت موجود ہے کہ انبیاء کرام جو انسانی دنیا کے لئے نمونہ قرار دئے گئے وہ سب ازدواجی بندھنوں میں بندھے ہوئے اور اہل وعیال والے تھے۔

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَّذُرِّيَّةً ﴾(الرعد ٣٨)

''اے محمد ہم نے آپ سے پہلے یقیناً بہت سے رسول بھیجے اور انھیں بیویوں اور اولاد سے نوازا''

ارشاد نبوی ہے﴿ أربع من سنن المرسلين الحياء والتعطر والسواك والنكاح﴾ (ترمذی) ''چار چیزیں پیغمبروں کی سنت میں سے ہیں، (۱) شرم وحیا (۲) خوشبو لگانا (۳) مسواک کرنا (۴) نکاح کرنا''

دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے﴿ النكاح من سنّتى فمن لم يعمل بسنتى فليس منّى ﴾(سنن ابن ماجة كتاب النّكاح ٥٩٢/١)

''نکاح کرنا میری سنت ہے اور جس نے میری سنت پر عمل نہیں

کیا وہ ہم میں سے نہیں''

نکاح کی تاکید اور اس پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی عورتوں کے فتنہ اور فحش کاری سے بچا رہتا ہے اور اس کے برعکس ایک غیر شادی شدہ انسان کے لئے انکے جال میں آسانی کے ساتھ پھنس کر اپنی عفت وعصمت کو بھینٹ چڑھانے کا خطرہ برابر برقرار رہتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ نکاح کے ذریعہ سے آزاد و بے قید جنسی ملاپ پر روک لگا دی جائے اور اس برائی کو ہر قیمت پر روکا جائے جو کسی بھی سوسائٹی کو برباد اور فنا کرنے کے لئے کافی ہے۔

نکاح ایک عبادت

چنانچہ اسلام میں نکاح کو ایک مقدس رشتہ اور قربِ خدا وندی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، بلکہ اسکو مجموعہ عبادات کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، یہ ایک ایسی عبادت ہے جسکی شان تمام عبادتوں میں جداگانہ اور نمایاں وممتاز ہے، ہر عبادت اس وقت تک عبادت ہے جب تک اس کو انجام دینے والا اس میں مشغول ہے، اور جیسے ہی اس عبادت سے فارغ ہوا اسکی یہ عبادت بھی ختم، نکاح ایک ایسی عبادت ہے کہ جب سے شوہر وبیوی ایجاب وقبول کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں اسی وقت سے مسلسل اسکا ثواب ملتا رہتا ہے، بلکہ اس رشتہ کو سنبھالنے اور اس کے فرائض وذمہ داریوں کو ادا کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور مختلف حالات میں صبر وضبط اور طبیعت کے بہت سے تقاضوں کو دبانے کے لئے نفس پر جو جبر کرنا پڑتا ہے، نیز اولاد کی تربیت اورانکی پرورش وکفالت کی گرانباری اور اس طرح کے بے شمار مسائل ومعاملات اس ازدواجی رشتہ کو مجموعۂ عبادات بنا دیتی ہیں۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کرنا تکمیل ایمان کا باعث ہے۔

﴿اذا تزوّج العبد فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللّٰہفی النصف الباقی﴾ (مسند أحمد ، کنز العمال) ''جب کوئی شخص نکاح کرتا ہے وہ آدھے ایمان کو پورا کر لیتا ہے تو اسے چاہئے کہ بقیہ آدھے میں اللہ سے ڈرے''

﴿قال رسول اللّٰہﷺمسکین مسکین مسکین رجل لیس لھاامرأۃ، وان کان کثیر المال ،مسکینۃمسکینۃ مسکینۃامرأۃ لیس لھا زوج وان کانت کثیرۃ المال﴾(کنز العمّال١٦ /٢٧٨-٢٧٩)

''رسول اللہﷺ نے فرمایا وہ شخص مفلس ہے، مفلس ہے مفلس ہے جسکی بیوی نہیں اگر چہ وہ بڑا مالدار ہو، اسی طرح وہ عورت بھی مفلس ہے، مفلس ہے، مفلس ہے جو بے شوہر ہے اگر چہ وہ بڑی مالدار ہو''

نکاح کے عباداتی پہلو سے غفلت

لیکن آج ہمارے معاشرہ میں اسکا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا کہ نکاح بھی کوئی عبادت ہے، چنانچہ آج نکاح جیسی بابرکت عبادت کو مختلف گندی اور ہندوانہ رسوم وخرافات سے ایسا بھر دیا گیا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر شادیوں کے موقع پر سوائے خطبۂ نکاح اور ایجاب وقبول کے ہر عمل اسلام کے خلاف ہوتا ہے، بلکہ کہیں کہیں یہ شادی غیر مسلموں کی شادیوں کا نمونہ ہوتی ہیں، بلکہ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جب لوگوں کے سامنے دین وشریعت اور سنت کی بات کہی جاتی ہے تو بہتوں کی پیشانی پر بل پڑنے لگتا ہے، اور ان کو اس وقت یہ بات حد درجہ ناگوار معلوم

ہوتی ہے،اور وہ سوچتے ہیں کہ ہماری اس خوشی کے موقع پر رخنہ ڈالا جارہا ہے،حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس موقع کی تصویران لفظوں میں کھینچی ہے،

''لیکن افسوس جس طرح کھانے کی سنت وعبادت سے غفلت ہی غفلت ہے، اسی طرح نکاح کی عبادت سے بھی غفلت ہی غفلت ہے، نکاح ہوتا ہے تو پورا خاندان شادی مناتا ہے ،سارے اعزہ خوشی مناتے ہیں ،لیکن بقول ایک بزرگ کے کہ سارے روٹھے منائے جاتے ہیں، نائی دھوبی ،بھشتی حتی کہ بھنگی کو بھی خوش کرلیا جاتا ہے،مگر معاذ اللہ!اللہ ورسول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور کہا جاتا ہے کہ یہ تو ارمان نکالنے کا وقت ہے سارے منہیات کئے جاتے ہیں،کھانوں میں بے جا تکلفات ،جہیز کے دکھاوے ،جہیز کے مطالبات ،حیثیت سے زیادہ مہر، باجا گاجا اور نہ جانے کیا کیا،۔۔۔یاد رکھو وہ ارمان ارمان نہیں جس سے اللہ ورسول کی ناراضگی ملے۔

(اسلام میں عورت کا درجہ ۱۲۷)

عبرت کا مقام

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب غیر اسلامی رسوم ورواج جو ہمارے معاشرہ کا ایک جزء بن چکا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم نے ان کے اثرات قبول کر لئے ہیں،جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ امتِ دعوت ہونے کی حیثیت سے ہم انکے لئے نمونہ بنتے ،اور اسلام کی سچی اور صاف ستھری ، پاکیزہ وپُرکشش تصویر پیش کرتے ، ہم خود ہی انکے دریوزہ گر بن گئے ،اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوؤں کی شادیوں میں جو کچھ رسمیں ہیں ،وہ کسی نہ کسی شکل میں مختلف ناموں سے ہمارے یہاں بھی موجود ہیں،جسکا نتیجہ یہ ہے کتنے خاندان جہیز وتلک کی منحوس لعنت سے تباہ وبرباد ہو گئے ، کتنے باپوں نے جہیز کا سامان مہیا کرنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے خودکشی کر لی ،اور کتنی با عزت وبا غیرت دوشیزائیں جو اپنے والدین کی بے چینی وبے قراری برداشت نہ کرسکیں انھوں نے اپنی جانیں دے دیں،اور کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جنکی شادیوں کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے دوسروں کے ہوس کا شکار ہوکر اپنی عزت وعصمت کو تارتار کرچکی ہیں ،اور نہ معلوم کیسے کیسے شیطانوں کا آلۂ کار بن رہی ہیں ،اور اسی جہیز کے نام پر کتنی بہوئیں آگ کی بھینٹ چڑھا دی گئیں،اور آئے دن یہ واقعات سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہمارے ملک میں پیش آتے ہیں اور کتنی بہوؤں کی زندگی مطلوبہ جہیز نہ لانے کے جرم میں جہنم بنی ہوئی ہے،

مسلمانوں کی ذمہ داری

ایسی صورت میں کیا مسلمانوں کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ حضورﷺ اور صحابہ کرام کے بتائے ہوئے نہایت آسان ونہایت پاکیزہ طریقہ پر اسلامی شادیوں کا نمونہ پیش کرتے ، جس کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا

﴿انّ أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة﴾(مسند أحمد٦،٨٢)

''سب سے زیادہ با برکت نکاح وہ ہے جس میں کم بوجھ پڑے یا سب سے کم خرچ ہو''

نکاح مشکل ،زنا آسان

ان رسوم ورواج سے آج شادی کو ایسا بوجھل بنا دیا گیا ہے، کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہوگیا ہے، کیونکہ جب تک مطلوبہ جہیز کا انتظام نہ ہوسکے اور لڑکی کے لئے اسکے معیار کا اتنا مالدار اور

باحیثیت شوہر نہ ملے تو شادی نہیں ہوسکتی، چاہے اسکی عمر کا جو بھی حصہ گزر جائے اور چاہے جتنے دنوں تک اسکو انتظار کرنا پڑے، تو ظاہر ہے کہ فطرتِ انسانی فطرتِ انسانی ہے اسکو کچلا یا فنا نہیں کیا جا سکتا ہے لہذا اس کے جتنے بھیانک اور خطرناک نتائج برآمد ہوں، کم ہے، لہذا ہر طرف بے حیائی کا بازار گرم ہوگیا، اسی لئے حضورﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ

﴿ثلاث یا علی لا توخرھنّ الصلاۃ اذا أتت والجنازہ اذا حضرت والأیم اذا وجدت کفوا﴾(ترمذی کتاب الصلاۃ) ''رسول اللہﷺ نے فرمایا اے علی! تم تین باتوں میں تاخیر مت کرو، نماز جبکہ اسکا وقت آجائے، جنازہ جبکہ وہ حاضر ہو جائے، اور بے نکاحی عورت یا مرد جبکہ اسکے لئے موزوں رشتہ مل جائے''

حضرت عمرؓ نے فرمایا﴿زوّجوا أولادکم اذا بلغوا، لا تحملوا آثامھم (أحکام النّساء از ابن جوزیؒ/۳۰۳) ''تمہاری اولاد جب بالغ ہو جائے تو انکا نکاح کر دو، اور انکے گناہ مت اٹھاؤ''

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا، ﴿بادروا نسائکم التزویج فانّ التسویف مغلمۃ لھنّ﴾(أحکام النّساء/۳۰۴) ''تم اپنی عورتوں کے نکاح میں جلدی کرو، کیونکہ اس میں تاخیر کرنا ان کے لئے (شہوانی اعتبار سے) ہیجان کا باعث ہوگا''

اور حضورﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ﴿ اذا خطب الیکم من ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ والا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الأرض وفساد کبیر﴾ (مشکوٰۃ: کتاب النکاح) ''اگر ایسا رشتہ پاجاؤ جسکی دینداری اور اخلاق سے مطمئن ہو تو فوراً شادی کردو ورنہ زمین میں بڑا فتنہ اور خطرناک فساد رونما ہو جائیگا''

اسی لئے اسلام نے نکاح کو بالکل آسان بنایا کہ انسان جنسی تسکین کیلئے غلط راستہ اختیار کرنے کی بات ہی نہ سوچے، لیکن آج لوگوں نے اسلام کی اس پُرحکمت تعلیم پر غور ہی نہیں کیا، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ روز بروز بے حیائی اور آوارگی کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے، دراصل ہمارا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ ہم اس مغرب کے طرز پر معاشرہ کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جہاں لوگوں کی حالت جانوروں سے زیادہ بدتر ہو چکی ہے، اور اس حیوانیت وعریانیت کے نتیجہ میں انکا خاندانی نظام بالکل بکھر چکا ہے، جسکی وجہ سے وہ اپنے اس معاشرہ سے اکتا چکے ہیں اور انکو تلاش ہے ایک پرسکون اور پائیدار و مستحکم ازدواجی اصولوں کی جو صرف اور صرف اسلام کے اندر موجود ہے، جسکی کوئی نظیر ومثال دنیا کے قوانین اور مذاہب میں نہیں ملتی ہے۔

نکاح کا اسلامی طریقہ

نکاح اور شادی کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ مرد کی طرف سے لڑکی کے سرپرستوں کو نکاح کا پیغام دیا جائے، اگر اسکے اولیاء رشتے کو مناسب سمجھیں تو لڑکی سے اسکی رائے لے لیں، جبکہ وہ عاقلہ اور بالغہ ہو، بصورت دیگر لڑکی کے اولیاء بہتر سمجھتے ہوئے اسکا مناسب رشتہ طے کر کے نکاح کر دیں، غرض نکاح کے موقع پر جو باتیں ضروری اور مسنون ہیں، وہ یہ ہیں (۱)طرفین کی رضا مندی (۲)دو گواہوں کی موجودگی (۳)ایجاب وقبول (۴)مہر (۵)خطبۂ نکاح (۶)حسب استطاعت ولیمہ۔

ان میں آخری دو چیزیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں، بلکہ

انکے بغیر بھی نکاح درست ہو جائیگا، البتہ نکاح کسی قدر اعلان وتشہیر کے ساتھ ہونا ضروری ہے، جسکا مقصد یہ ہے کہ یہ تعلق مجرمانہ اور رازدارانہ طریقہ پر اور چوری چھپے نہیں ہے، باقی اسکے علاوہ جو بھی رسوم ورواج ہیں وہ غیر ضروری بلکہ غیر اسلامی ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر خرافات ومنکرات کی فہرست میں آتے ہیں، جو غیر قوموں سے میل جول اور نقالی کا نتیجہ ہیں۔

رشتہ کے انتخاب کا معیار

نکاح کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بیوی کے انتخاب کا معیار کیا ہو؟ نبی فطرت اور دین کامل نے اس سلسلہ میں اپنے ماننے والوں کو اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ انکو ایک ایسا معیار دے دیا جس سے نکاح کے پورے فوائد ومقاصد کے حصول میں مدد ملے، اور بیوی وشوہر کی زندگی خوشگوار سے خوشگوار ترین بن جائے، ایک دوسرے کے حقیقی رفیق اور خیر خواہ بنیں، اور انکی دنیا بھی جنت کا نمونہ بن جائے، یہی وجہ ہے کہ اچھی عورت کو دنیا کی بہترین نعمت قرار دیا گیا ہے،

﴿الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأة الصالحة﴾(مسلم کتاب الرضاع)

''پوری دنیا بس وقتی نفع پہچانے والی چیز ہے، اور دنیا کے بہترین سامانوں میں سب سے بہترین سامان نیک بیوی ہے''

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے اچھی بیوی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ذرا تفصیل سے بیان فرمایا کہ ''مومن کو اسلام کے بعد سب سے زیادہ اچھی بیوی سے فائدہ پہنچتا ہے، اور اچھی بیوی کے اوصاف یہ ہیں کہ جب شوہر اسکو حکم دے تو فورا اسکی تعمیل کرے، اگر اسکو دیکھے تو اسے خوشی حاصل ہو، نیز شوہر کی عدم موجودگی میں اسکے مال کو ضائع نہیں کرتی اور اپنی ذات سے اسے کسی طرح کا رنج نہ پہنچنے دیتی ہو'' (سنن نسائی کتاب النکاح ۶۸۱/۲)

عام طور پر انسان اپنی کوتاہ نظری اور بے عقلی کی وجہ سے بیوی کے انتخاب میں حسنِ صورت اور مال ودولت کو ترجیح دیتا ہے، اور ایسی عورت سے نکاح کرنے کا زیادہ خواہش مند نظر آتا ہے جو شکل وصورت میں ممتاز ہو، یقیناً یہ اوصاف بھی اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن اسلام نے قابلِ ترجیح وصف دین داری کو قرار دیا ہے، جس شخص کو دیندار بیوی مل جائے وہ بڑا خوش نصیب اور کامیاب ہے، کیونکہ حقیقی دینداری عورت کو تمام حقوق ادا کرنے، برائیوں سے بچنے اور ہر قسم کی خیر خواہی پر آمادہ کرے گی جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شوہر کی اطاعت، اپنی عصمت کی حفاظت، مال ومتاع کی نگرانی خرچ میں کفایت شعاری، اولاد کی تربیت اور شوہر کی خیر خواہی وغیرہ تمام کام بہترین طریقہ پر انجام دے گی اور ان تمام خوبیوں کی حامل ہو گی جو ایک بہترین رفیقۂ حیات میں مطلوب ہوتی ہیں، اسی لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

﴿لا تزوجوا النساء لحسنهنّ فعسى حسنهن أن يرديهنّ ولا تزوجوهنّ لأموالهنّ فعسى أموالهنّ أن تطغيهنّ، ولكن تزوجوهنّ على الدين ولأمة خرماء سوداء ذات دين أفضل﴾(ابن ماجه)

''عورتوں سے ان کے حسن وجمال کی بنا پر نکاح مت کرو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اسکا حسن وجمال اسکو مغرور بنا دے، نیز تم عورتوں سے ان کی مالداری کی بنا پر نکاح مت کرو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ انکا مال انہیں سرکش بنا دے، لیکن تم ان سے ان کی دینداری کی بنا پر شادی کرو اور یاد رکھو کہ ایک کالی کلوٹی اور کن

کٹی مگر دیندار لونڈی بھی البتہ افضل ہوسکتی ہے''

لہذا عورت کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اسکی ظاہری خوبیوں پر نظر کم اور باطنی خوبیوں کو زیادہ ٹٹولنا چاہئے، کیونکہ مال ومتاع، حسب ونسب، حسن وخوبصورتی یہ تمام چیزیں زائل اور فنا ہونے والی ہیں، حسنِ اخلاق اور اچھی سیرت وکردار مستقل اور پائیدار ہے، اور یہی لڑکے کے انتخاب کا معیار ہونا چاہئے، کیونکہ بیوی کے حقوق ادا کرنے پر آمادہ کرنے والی خوفِ خدا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی ہے، اسی لئے حسن بصریؒ نے فرمایا، ''ایسے شخص سے نکاح کرنا جو اللہ سے ڈرتا ہو، پھر یہ حکمت بیان فرمائی ﴿فانّہ ان أحبّھا أکرمھا وان أبغضھا لم یظلمھا﴾

''کیونکہ اگر وہ اسے پسند کریگا تو اسکی قدر کریگا اور ناپسند کرنے کی صورت میں ظلم بھی نہیں کریگا'' (معاشرتی مسائل ۳۲)

مہر

مہر کے معاملہ میں بھی بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض جگہوں پر اتنا زیادہ مقرر کیا جاتا ہے کہ اسکی ادائیگی دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتی ہے، اور بعض جگہوں پر اتنا معمولی اور کم ہوتا ہے کہ ہنسی آتی ہے، اور اس معاملہ میں سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مہر جو بھی مقرر کرلیا جائے اسکی ادائیگی کی نیت ہی نہیں ہوتی، حالانکہ مہر کو ادا نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ مہر عورت کا حق ہے، اور وہ اسکی پوری طرح مالک قرار پاتی ہے، کہ اسے جس طرح چاہے اپنی مرضی سے خرچ کرے، مہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن نے اسے بعض جگہ ''فریضة'' یعنی فرض قرار دیتے ہوئے اسے ادا کرنے کی تاکید کی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ (النساء ٢٤)

''جن عورتوں سے تم لطف اندوز ہو چکے ہو انکے مقرر شدہ معاوضہ انہیں دیدو''

دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء ٤)

''اور اپنی عورتوں کے مہر انھیں خوشدلی سے دے دیا کرو''

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

''اس مہر کو سرسری سمجھنا، ادا کی نیت نہ رکھنا اتنی بڑی سخت بات ہے کہ حدیث میں اس پر بہت سخت وعید آئی ہے،'' کنز العمال اور بیہقی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اسکا کچھ مہر ٹھہرائے، پھر یہ نیت رکھے کہ اس کے مہر میں سے کچھ اسکو نہ دیگا یا پورا نہ دیگا تو وہ زانی ہو کر مریگا، اور اللہ تعالیٰ سے زانی ہو کر ملیگا، اسی حدیث میں ایک دوسرا جزء اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر کسی سے کچھ مال خریدے اور اسکی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے یا کسی کا کچھ قرض وغیرہ ہو اور اسکو ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خیانت کرنے والا اور چور ہوگا، اور ظاہر ہے کہ مہر بھی ایک دَین (قرض) ہے، جب اسکے ادا کرنے کی نیت نہ ہوگی تو حدیث کے اس دوسرے جزء کے اعتبار سے یہ شخص خائن اور چور بھی ہوا، تو ایسے شخص پر دو جرم ہوئے، زانی ہونے کا اور خائن وسارق ہونے کا، کیا اب بھی یہ کوئی قابل تدارک نہیں؟

(اسلامی شادی، حضرت تھانویؒ مرتبہ مفتی محمد زید

مظاہری ۱۳۸)

احادیث میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہت اور کم ٹھہرانے کی ترغیب آئی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مہروں میں زیادتی مت کرو، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت یا اللہ کی نظر میں تقوی کی بات ہوتی تو سب سے زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ ﷺ تھے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

﴿خیر الصداق أیسرہ﴾ (ابو داؤد ۲/ ۵۹۱)" بہترین مہر وہ ہے جو آسان ہو"

مہر کی کم سے کم مقدار

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اسکی کم سے کم مقدار دس درہم ہے، یعنی اس سے کم جائز نہیں حتی کہ اگر صراحتاً بھی اس سے کم مقرر کیا جائے تو بھی دس درہم واجب ہوں گے، دس درہم کی مقدار آج کے وزن کے اعتبار سے تقریبا ۳۴ گرام چاندی ہے۔

مہر فاطمی اور ازواج مطہرات کا مہر

نبی اکرم ﷺ نے اپنی اکثر ازواج مطہراتؓ کا مہر پانچ سو درہم (جو تقریبا ۱۳۱/تولہ چاندی ہے) مقرر فرمایا تھا، ازواج مطہراتؓ میں صرف حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم (۱۲کلو ۲۴۸ گرام چاندی) مقرر ہوا تھا، جو اصحمہ نجاشی شاہ حبش نے حضور ﷺ کی طرف سے ادا کیا تھا اور ازواج مطہرات کے برابر ہی تقریبا مہر آپ نے اپنی اکثر صاحبزادیوں کا مقرر کیا تھا، حضرت فاطمہؓ کا مہر راجح یہ ہے کہ چار سو مثقال مقرر کیا گیا تھا جسکا وزن تقریبا ۱۵۰ تولہ چاندی ہوتا ہے، (معاشرتی مسائل ۵۲)

الغرض مہر کے سلسلہ میں مناسب یہ ہے کہ طرفین کی حیثیت کے اعتبار سے مہر مقرر کیا جائے تا کہ اسکی ادائیگی میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ اسکا ادا کرنا دشوار ہو اور نہ اتنی کم ہو کہ اسکی حیثیت ہی ختم ہو جائے، بعض لوگ ریا ونمود اور فخر ومباہات، شہرت وریا کاری کے لئے کئی کئی لاکھ مہر طے کرتے ہیں لیکن دل میں دینے کی نیت پہلے ہی نہیں ہوتی، بلکہ مقصود صرف دکھاوا اور نام کمانا ہوتا ہے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

بعض عقلاء مہر کی زیادتی میں یہ مصلحت سمجھتے ہیں کہ شوہر بیوی کو چھوڑ نہ سکے گا، اگر مہر کم ہے تو شوہر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور اسکو اس امر سے کوئی مانع نہیں ہوتا کہ اسکو چھوڑ کر دوسری کر لے، اور کثرتِ مہر میں ذرا رکاوٹ رہتی ہے، یہ عذر بالکل لغو ہے، جنکو چھوڑنا ہوتا ہے وہ چھوڑ ہی دیتے ہیں، خواہ کچھ بھی ہو، اور جو مہر کے مطالبہ کے خوف سے نہیں چھوڑتے وہ چھوڑنے سے بدتر کر دیتے ہیں، کہ نکاح سے تو نہیں نکالتے مگر حقوق بھی ادا نہیں کرتے، انکا کوئی کیا کر لیتا ہے، (اسلامی شادی ۱۴۲)

مہر کے تعلق سے ایک بڑی کوتاہی یہ بھی ہوتی ہے کہ بہت سارے لوگ مہر بیوی سے معاف کرا لیتے ہیں، جس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بڑی بے غیرتی اور ذلت کی بات ہے کہ بیوی سے پہلی ہی ملاقات میں اس کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا اور معافی کی درخواست کرنے لگے، بلکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ اگر وہ معاف بھی کرنا چاہے تو دے اور بلا وجہ اسکا احسان نہ لے،

اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کی معافی کا اعتبار بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ معافی شرما حضوری اور بسا اوقات جبر کی وجہ سے ہوتی ہے، اور کسی کا مال اس وقت جائز ہے جبکہ وہ دل کی خوشی کے ساتھ ہو، اور اسکا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ مہر کی رقم بیوی کے حوالہ کر دی جائے، اسکے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر

کسی دباؤ کے واپس کر دے، تو یہ طیبِ نفس یعنی دل کی خوشی ہے، شرم وحیا یا ماحول ومعاشرہ کے دباؤ یا جبر سے کوئی کام طیبِ نفس میں داخل نہیں ہے، اسلئے اس طرح سے معاف کرائی ہوئی مہر ہرگز معاف نہیں ہوتی، بلکہ شوہر کے ذمہ قرض رہتی ہے، لہذا اگر بغیر مہر ادا کئے شوہر کا انتقال ہوگیا تو اسکے ترکہ سے عورت کا مہر دلوایا جائے گا،

خطبۂ نکاح میں ''اتقوااللہ'' کی تکرار کا راز

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس راز کو اپنے ادبی اسلوب میں اس طرح اجاگر کیا ہے، فرماتے ہیں!

۔۔۔یہ منزلیں وہ ہیں جن سے ہر راہ رو کو گزرنا ناگزیر ہے، مرد وہ ہے جو یاد رکھے ان سب موقعوں پر اپنی ذمہ داریوں کو۔ خالق کے سامنے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی پیشی کو۔ یہ راز ہے ''اتقوا اللہ'' کی تکرار کا۔ یہ معنی ومفہوم ہیں محفلِ نکاح میں ایجاب وقبول کے، شوہر نے دعوت دوست احباب کی بڑی دھوم سے کی بیوی کی ذراسی بے توجہی سے عین وقت پر کھانا بالکل خراب ہوکر رہا، اب طبیعت ہیکہ غصہ سے بے خود ہوئی جاتی ہے، اور نفس مضطرب ہے کہ زیادہ سے زیادہ سزا ممکن ہو گھر کی مالکہ کو دی جائے۔ یہ موقع ہے ''اتقوا اللہ'' پر عمل کا! شوہر مدت کے بعد پردیس سے گھر آتا ہے، راستہ بھر خواب دیکھتا ہوا کہ بیوی سے یوں مزے مزے کی باتیں ہوں گی، گھر پہونچا تو دیکھا کہ بیوی بیمار پڑی ہے، معمولی بات بھی مشکل۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ کیسی کچھ پیدا ہو کر رہی یہ وقت ہے ''اتقوا اللہ'' کے یاد کرنے کا! میاں بیوی میں بات چیت معمولی ہنسی دل لگی سے شروع ہوئی، بیوی کی زبان سے بات کوئی ایسی نکل گئی کہ میاں کے دل میں چبھ گئی۔ قوت اسے حاصل، حکومت اس کی، اختیارات اس کے ہاتھ میں، بالکل بس میں ہے کہ جو چاہے سزا دے ڈالے۔ یہ گھڑی ہے ''اتقوا اللہ'' کی قدر کرنے کی!

خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے، دنیا میں جس قدر بھی رنجشیں، جن اسباب سے بھی واقع ہوتی ہیں، یہ سب پیدا کہاں سے ہوتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ سابقے سے، اگر سرے سے سابقہ ہی نہیں تو کسی نزاع، کسی بےلطفی کا امکان ہی نہیں۔ اب دنیا میں کوئی رشتہ، کوئی تعلق اس میاں بیوی کے رشتے سے بڑھ کر ایک دوسرے سے سابقہ رکھنے والا، اشتراک رکھنے والا ہے؟ چوبیس گھنٹوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ، یہ اس کے ہر راز سے واقف، وہ اس کے ہر بھید سے خبردار۔ مرد نیک سا، نیک سہی، بیوی مطیع سی مطیع سہی، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ تصادم کی صورتیں پیش نہ آتی رہیں؟ اور قوت چونکہ شوہر ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسلئے قدرتاً اس کے استعمال کی تحریک بھی اسی کے نفس میں زائد ہوتی ہے۔ پھر رشتے کی نوعیت یہ کہ بیوی کی جان پر جو کچھ بھی گزر جائے باہر والوں کو خبر تک نہ ہو۔ شوہر کو نہ اپنی رسوائی کا اندیشہ، نہ انتقام کا خوف۔ ان تمام موقعوں پر ایسے سارے حالات میں کون سی شے ایسی ہے جو شوہر کو قابو میں اس کے مزاج کو حدود کے اندر رکھ سکے؟ بجز اس ایک شے کے، جس کا نام خوفِ خدا، تقویٰ الٰہی ہے۔۔۔ خطبۂ نکاح میں ''اتقوا اللہ'' کی کثرت کا راز، کیا اب بھی راز باقی رہا؟۔

(خطبات ماجد یا ہدیۂ زوجین از مولانا عبد الماجد دریابادیؒ ۳۴-۳۵)

ولیمہ

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لئے اس طرح کے مواقع کے لئے بھی اس میں انسانی مزاج کی پوری رعایت موجود ہے، چونکہ شادی ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے، شریعت نے اس موقع پر خوشی ومسرت ،فرحت وانبساط کے اظہار کو مستحسن ہی نہیں بلکہ باعثِ اجروثواب قرار دیا ،اور اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی حیثیت کے مطابق لوگوں کی دعوت کرے اور ولیمہ کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ اس نکاح کی تشہیر بھی ہوجائے اور لوگوں کو اس رشتہ کا علم ہوجائے،

ولیمہ کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے، نہ کہ عورت اور اس کے سرپرستوں پر، لہٰذا موجودہ دور میں نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کے یہاں کھانے کھلانے کا جو رواج چل پڑا ہے وہ بالکل غلط اور لڑکی والوں پر زبردستی کا بوجھ ہے، چنانچہ شریعت میں کہیں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کو دعوت کے لئے کہا گیا ہو، یا دور رسالت میں کسی نے ایسا کیا ہو، بلکہ اس کے برعکس آپ ﷺ نے نہ صرف اپنے ہر نکاح کے موقع پر ولیمہ خود اپنی طرف سے کیا بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ ولیمہ کریں، (اسلام کا قانون نکاح ۱۴۹)

ولیمہ کے بارے میں جو حدیثیں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولیمہ نہایت سادگی کے ساتھ کر کے پوری امت کے لئے ایک نمونہ چھوڑ دیا ہے، کبھی آپ نے ولیمہ کھجور اور پنیر اور جو کے ذریعہ کیا، اور سب سے بھاری ولیمہ آپ نے حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح کے موقع پر کیا تھا ،جس میں آپ نے بکری ذبح کی تھی۔

جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ولیمہ میں گوشت اور بریانی کھلانا ضروری نہیں ہے، بلکہ بغیر کسی مشقت کے موقع پر جو بھی میسر آجائے اس کے ذریعہ سے ولیمہ کی سنت ادا ہوجائے گی، حضرت علیؓ نے ولیمہ کیا اور ولیمہ میں یہ سامان تھا، چند صاع جو (جو ساڑھے تین سیر کے قریب ہوتا ہے) اور کچھ خورمہ اور کچھ ملیدہ، (اسلامی شادی ۲۳۷) اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اپنے نام ونمود کے لئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دعوتِ ولیمہ کرنا جس میں بہت سے لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ بالکل درست نہیں ہے، اور وہ ولیمہ جس میں صرف مالداروں ہی کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے وہ بدترین ولیمہ ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ﴿ شرّ الطعام طعام الوليمة يدعىٰ فيها الأغنياء ويترك فيها الفقراء﴾ (بخاری ۷۷۷/۲) ''بدترین ولیمہ وہ ہے جس میں مالداروں کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے''

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں! ''ولیمہ مسنون ہے، وہ بھی خلوص نیت واختصار کے ساتھ، نہ کہ فخر واشتہار کے ساتھ، ورنہ ایسا ولیمہ بھی جائز نہیں، حدیث میں ایسے ولیمہ کو ''شرّ الطعام'' فرمایا گیا ہے، نہ ایسا ولیمہ جائز ہے، نہ اس کا قبول کرنا جائز، اس سے معلوم ہوگیا کہ برادری کو اکثر کھانے جو کھلائے جاتے ہیں ان کا کھانا کھلانا کچھ جائز نہیں، دیندار کو چاہئے کہ نہ خود رسموں کو کرے اور جس تقریب میں یہ رسمیں ہوں ہرگز وہاں شریک نہ ہو، صاف انکار کردے، برادری کی رضامندی اللہ کی ناراضگی کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئے گی؛'' (اصلاح الرسوم ۹۳)

☆☆☆

تعلیم وتربیت

میں مسلسل انکار کرتا رہا پھر اچانک ہاں کہہ دیا

محمد الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی
nadviacademy@hotmail.com

صبح گیارہ بجے کے آس پاس کا وقت تھا، میں علی پبلک اسکول بھٹکل کے اپنے باہری آفس میں بیٹھا ہوا تھا، داخلوں کا زمانہ تھا، اندر اسکول میں خواتین کی بھیڑ تھی جو اپنے بچوں کے داخلہ کی کارروائی میں مشغول تھیں، اندر سے اطلاع آئی کہ ایک خاتون داخلہ کے سلسلہ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہے، میں نے اسے بلایا تو وہ اپنے بھائی اور دو بچوں کے ساتھ داخل ہوئی، ایک بچہ تو چل رہا تھا، دوسرے کو اس کا ماموں کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا، چونکہ داخلہ کا زمانہ تھا اس لیے یہ ماجرا دیکھ کر ان کا مدعا سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی ، بچہ کی ماں نے کہا مولانا: میرے ایک بچہ کا داخلہ تو ہوگیا ہے لیکن اس دوسرے کے داخلہ سے اندر ہیڈ مسز نے انکار کردیا ہے، یہ دونوں جڑواں بھائی ہیں، یہ برابر ضد کررہا ہے کہ میں بھی بھائی کے ساتھ اسکول جاؤں گا، یہ صرف پیروں سے معذور ہے، باقی جسم کے تمام اعضاء الحمدللہ اس کے محفوظ اور سلامت ہیں ، آپ کسی طرح اس کا بھی داخلہ کروادیجئے، بڑی مہربانی ہوگی۔

میں نے بچہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، تقریباً 5/4 سال کا بھاری بھرکم جسم والا معذور بچہ، مجھے لگا یہ بچہ ہمارے اسکول کے لیے بوجھ بنے گا، پہلے اس کے گھر سے گود میں لے کر گاڑی میں ملازمہ کو اسکول بس میں اس کو بٹھانا ہوگا، پھر اسکول میں گاڑی سے اتار کر درجہ میں معلّمہ کے حوالے کرنا ہوگا، یہ خود سے کرسی پر بیٹھ نہیں سکتا، بٹھانا ہوگا، استنجاء اور قضائے حاجت کے لیے بار بار ٹوئلیٹ لے جانے کی زحمت الگ ہوگی ، درجہ کے دیگر طلباء شرارت پر اتر آئیں اور اس کو کرسی سے گرادیں اور اس کو چوٹ لگے تو یہ بدنامی الگ سے ہوگی ، اس طرح کے موہوم خدشات کے پیش نظر میرے دل میں آیا کہ ایسے دسیوں معذور بچے مختلف گھروں میں ہیں، اس کو بھی انہی کی طرح گھر میں بیٹھنا چاہیے، یہ سوچ کر میں نے بڑی محبت سے اپنی مجبوری بتادی اور داخلہ سے معذرت کردی، میری بھی مجبوری تھی کہ پڑھانے والی معلمات خود جب انکار کررہی تھیں تو میں بھی کیا

کرسکتا تھا، پڑھانا اور سنبھالنا تو ان کو تھا۔

میری اس معذرت کے بعد دیر تک وہ ماں کھڑی انتظار کرتی رہی کہ شاید میرا دل پسیج جائے اور میں ہاں کہہ دوں لیکن میں نے ہاں نہیں کہا، کچھ دیر کے بعد وہ مایوس ہوکر باہر چلی گئی، میں نے دیکھا کہ اسکول کے کونے میں رکھی کرسی پر ڈھیر ہوکر ایک طرف سر جھکائے بیٹھ گئی ممتا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور زبانِ قال سے نہیں زبانِ حال سے اپنے رب سے مخاطب ہوئیں کہ اے رحیم آقا:۔ میرے بچہ کی اس معذوری پر میرا کیا قصور ہے، اگر میری جگہ ان کا بچہ تو معذور پیدا کرتا تو کیا یہ اسی طرح کے بہانے بنا کر اپنے بچہ کو بھی واپس کردیتے؟

یہ ماجرا دیکھ کر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں، مجھے میرے ضمیر نے بھی جھنجھوڑنا شروع کردیا اور آس پاس کی دنیا سے غافل ہوکر میں بھی کسی اور دنیا میں پہنچ گیا، میں نے اپنے دل سے وہی سوال دہرایا جو اس خاتون نے زبان حال سے اپنے رب سے کیا تھا، میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ اگر بالفرض اس کی جگہ میرا بچہ اتنا ہی نہیں اس سے بھی زیادہ اگر معذور ہوتا تو کیا میں اس موقع پر اسی طرح کے خدشات اور موانع سوچ کر اپنے بچہ کو اپنے اسکول میں داخلہ سے محروم رکھتا، دل نے کہا نہیں ہرگز نہیں۔ اگر میرا ہی نہیں میری کسی بہن، بھائی یا دور کے رشتہ دار کا بھی بچہ ہوتا تب بھی میں کسی طرح گنجائش نکالتا، مجھے تو اپنے رحیم وکریم آقا اور رحمان ومنّان رب کا کروڑہا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اپنی بداعمالیوں کے باوجود اس نے محض اپنے فضل سے میرے کسی بھی بچہ کو ادنیٰ معذوری سے بھی محفوظ رکھا، اس فضل خداوندی کا حق تو یہ ہے کہ میں اس معذور بچہ سے اپنے بچہ کی طرح پیار کروں، اس کے لیے ممکنہ سہولت اور گنجائش نکال کر اس کے لیے تعلیم کی سہولت فراہم کروں، اس خیال کے آتے ہی میں نے اندر سے اہلیہ کو آواز دی اور اس سے کہا جو کچھ ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا، فی الحال تم اس کے داخلہ کی کارروائی مکمل کرو۔

اس رات میں سونے کے لیے اپنے بستر پر گیا تو خلاف معمول مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آئی اور میری نظروں کے سامنے اپنے رشتہ داروں، دوست واحباب اور جاننے والوں کے ان سب معذور اور بیمار بچوں کی تصویریں گھومنے لگیں جو پیدائشی اعذار کے ساتھ اس دنیا میں آئے ہیں اور ابھی تک اپنی عمر کے 10/10 سال اور 12/12 سال گذارنے کے باوجود بھی اپنی ان ہی معذوریوں کے ساتھ اپنے والدین کے لیے صبر وضبط کے مجسم پیکر بن کر ہمیں خدائے تعالیٰ کی بے پناہ نعمتوں کی یاد دلا رہے ہیں، اس میں سب سے عبرت انگیز واقعہ جو مجھے یاد آیا وہ شہید ملت شیخ احمد یاسین کا تھا، تیرہ سال کی عمر میں اپنے معمول کی ورزش کے دوران ایک پہاڑی سے کودتے ہوئے ان کی گردن ایک چٹان سے ٹکرا گئی تھی جس سے ان کے جسم سے نیچے کا حصہ مفلوج ہوگیا تھا، ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت کے لیے درخواست دی تو اس اعلیٰ افسر نے انٹرویو کے تمام مراحل میں بآسانی کامیاب ہونے کے باوجود صرف یہ کہہ کر انکار

کر دیا کہ یہ مفلوج ہیں، اپنے محبوب بندے کے ساتھ اس کا یہ ناروا سلوک اللہ تعالیٰ کو اتنا ناپسند آیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس افسر کے یہاں بچہ کی ولادت ہوئی تو وہ ان سے زیادہ معذور تھا، خود اپنے شہر میں ایک بڑے عالم دین کے تینوں بچوں کو ہونے والی اس طرح کی معذوریاں بھی مجھے رہ رہ کر سب سے زیادہ بے چین کرنے لگیں، اس میں ایک نیک وصالح فرزند کے تین بچے ہیں، اس میں پہلی بچی اور آخری بچہ دونوں اس طرح معذور ہیں کہ 8/7 سال کے ہونے کے باوجود بستر سے اٹھ نہیں سکتے، بول نہیں سکتے، دیکھنے میں انتہائی حسین معصوم اور خوبصورت، صبح سے شام تک 24/ گھنٹے پیشاب پاخانہ سے بچانے کے لیے پیمپر (Pampers) میں رہتے ہیں، ان کی آزمائشوں کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ خود ان کا کہنا ہے کہ ان کی مہینے بھر کی پوری کمائی صرف پیمپر کے لیے بھی ناکافی ہوتی ہے، لیکن وہ اللہ کا بندہ اس قدر صابر وشاکر ہے کہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بے پناہ فضل مجھ پر ہے، کتنے ایسے ہیں کہ ان کے سب بچے معذور پیدا ہوئے ہیں، رحمان ورحیم آقا نے مجھ پر رحم کیا، کم از کم میرا ایک بچہ تو صحیح سالم اور معذوری سے پاک اس نے پیدا کیا، اس نیک والدین کے اس جذبۂ شکر پر اس کریم ذات کو کس قدر رحم آتا ہوگا اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے محلّہ میں ایک صاحب ہیں، ان کی بچی شادی کی عمر تک پہنچ گئی ہے لیکن پیدائشی طور پر اس طرح معذور ہے کہ اٹھنا تو دور کی بات ہل بھی نہیں سکتی، صبح شام پیمپر میں رہتی ہے، اس کی وجہ سے اس کی والدہ اس کو چھوڑ کر گھر سے باہر نہیں نکلتی، خاندان میں شادی بیاہ اور خوشیوں کی تقریبات میں شرکت اسی معذور بچی کی نذر۔

ہمارے ایک عالم دین دوست کا ابھی کچھ دنوں پہلے بچہ پیدا ہوا، پیدائش ہی سے دل کا مریض، ڈاکٹروں نے کہا کہ دل میں سوراخ ہے فوری آپریشن نہ ہوا تو خطرہ بڑھ سکتا ہے، کئی لاکھ کا خرچ بتایا گیا ہے، عدم سہولت کے باوجود وہ علاج میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب کو دیکھا تین سال کا بیٹا اتنا موٹا چشمہ لگائے ہوئے ہے جتنا کسی زمانہ میں ہمارے دادا مرحوم کا تھا، کہنے لگے کہ پیدائشی بینائی کمزور ہے، دور کا ہی نہیں قریب کا بھی نظر نہیں آتا۔ ہمارے جاننے والے ایک دوست ہیں ان کے بچہ کا پیر پیدائشی مڑا ہوا ہے، سیدھے چلنا ممکن ہی نہیں ہے لاکھوں خرچ کئے، لیکن تخلیق قدرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکی۔ ایک صاحب کا بچہ 19/18 سال کا ہوگیا، لیکن سر اتنا چھوٹا کہ نومولود کا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست سعودی عرب میں رہتے ہیں، ان کے دو بچے پڑھنے میں انتہائی ہوشیار تھے، گھر کے باہر اپنے رشتہ دار کے یہاں جاتے ہوئے گر گئے اور ایسی چوٹ لگی کہ زندگی بھر کے لیے معذور ہوگئے، ایک کا ابھی پانچ چھ ماہ پہلے انتقال ہوا اور ایک کا سات سال پہلے۔

غرض یہ کہ ایسے دسیوں نہیں سینکڑوں بچے آپ کو خود اپنے خاندان، محلّے اور گاؤں میں نظر آئیں گے جو پیدائشی معذور

پیدا ہوئے ہیں یا بعد میں کسی حادثہ کی وجہ سے جسمانی اعتبار سے مفلوج ہوگئے ہیں اور اپنے والدین کے لیے صبر وتسلیم کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، رات بھر یہ سب سوچ کر اس نتیجہ پر پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی کہ اولاد کا ہونا اللہ تعالی کی الگ نعمت ہے اور ان کا صحیح سالم پیدا ہونا اس سے بڑی صرف ایک نعمت نہیں بلکہ ہزاروں نعمتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ہمارا بچہ چل رہا ہے بڑی نعمت ہے، بول سکتا ہے اس سے بڑی نعمت ہے، سننے کی صلاحیت باقی ہے، اس نعمت کا کوئی متبادل نہیں، آنکھیں سلامت ہیں، بآسانی قریب دور کا دیکھ پاتا ہے، جسم کا ہر عضو اللہ تعالی نے بدصورتی اور معذوری سے محفوظ رکھا ہے، یہ اسی کا عظیم احسان ہے۔

غرض یہ کہ ہمارا ایک بچہ جو ہمیں محض فضل خداوندی سے عطا کیا گیا ہے وہ تنہا رحمان ورحیم رب کی ہزاروں نعمتوں کا مجموعہ ہے، اگر ہم صرف اپنے کسی ایک بچہ کے ایک عضو کے اللہ تعالی کی طرف سے محفوظ رکھے جانے پر اس کا زندگی بھر شکر ادا کریں تو اس نعمت کا حق ادا نہیں ہوسکتا، میں یہ بھی سوچتا رہا کہ جس کے بچے معذور ہیں وہ مجھ سے زیادہ نیک، صالح اور دیندار ہیں، میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس سے زیادہ آزمائشوں میں ڈالے جانے کا مستحق تھا، لیکن یہ بے پناہ رحمت الہی تھی کہ اس نے مجھے محض اپنے فضل سے اس آزمائش سے محفوظ رکھا۔

اللہ پاک کے ہم پر بچوں کے ہر ہر عضو کی سلامتی کی صورت میں جو احسانات ہوئے ہیں اس پر ہم صبح وشام کم از کم 2/1 مرتبہ ہی سہی اپنے ان بچوں کا نام لے لے کر شکرِ خداوندی کے لیے اپنی زبان کو حرکت دیں گے تو اس پر رب کریم کی ذات عالی کس قدر خوش ہوگی ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، اس کا سب سے پہلے اثر یہ ہوگا کہ آئندہ کے لیے ان بچوں کی ہر طرح کی معذوری سے حفاظت کے قدرت الہی کی طرف سے فیصلے ہوں گے اور ہر طرح کے موذی مرض سے بھی اللہ پاک ان کو محفوظ رکھیں گے۔

بچوں کی صورت میں اللہ تعالی کی طرف سے ہمیں دی گئی ان نعمتوں کا اصل حق تو یہ ہے کہ ہم ان کو دینی تعلیم سے آراستہ کریں، عالم دین بنائیں، حافظ قرآن بنائیں، ان کی دینی بنیادوں پر تربیت کریں، بے جا لاڈ پیار سے ان کے اخلاق نہ بگاڑیں، بری صحبتوں سے ان کو بچائیں جس عظیم مقصد کے لیے ان کی اللہ تعالی نے پیدائش کی ہے اس کو ہمیشہ سامنے رکھیں، اسی کے مطابق ان کی پرورش کریں اور اپنے ان بچوں کو بھی رب کریم کی ان بے پناہ نعمتوں کا استحضار کرائیں جو صرف تنہا ایک انسان کی صحیح سالم پیدائش کے ساتھ ہزاروں نعمتوں کی شکل میں ہمارے لیے ہوئی ہیں اور ہمیشہ اس قرآنی دعا کا ورد جاری رکھیں کہ اے اللہ:۔ ہمارے لیے ہماری اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔

(رَبّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أزواجِنا وَذُرّياتِنا قُرّةَ أعيُنٍ
وَاجعلنَا لِلمُتّقين إماماً)

☆☆☆

نقطۂ نظر

دینی مدارس اور بیرونی ملکوں میں
اردو زبان کی اشاعت

پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سعود عالم قاسمی.....ڈائریکٹر، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دینی مدارس اصلا اسلامی علوم و ثقافت کی تدریس و اشاعت کے لیے قائم ہوئے ہیں۔ان کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو قرآن وحدیث، فقہ اور دوسرے اصلاحی علوم کے ماہر ہوں اور وہ ان علوم کی حفاظت اور اشاعت کا فریضہ انجام دے سکیں، مسلمانوں کی شرعی رہنمائی کر سکیں اور دینی مراکز مثلا مساجد، مدارس اور علمی اداروں کی خدمت انجام دے سکیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مقصد کی تعلیم دینے والے بیشتر اداروں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے بلکہ جنوبی ہندوستان میں بھی بہت سے مدارس کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے۔ان مدارس کے سند یافتہ حضرات جہاں اسلامی علوم سے واقف ہوتے ہیں وہاں اردو زبان سے اور کسی حد تک اردو ادب سے بھی ان کی واقفیت اور وابستگی ہوتی ہے۔ چونکہ اردو زبان عربی و فارسی کی لفظی وراثت پر قائم ہے اور ان مدراس میں اسلامی کتابوں کی زبان فارسی وعربی ہے، اس لیے ان فضلا کو اردو زبان سمجھنے، لکھنے، پڑھنے اور بولنے پر اچھی قدرت حاصل ہوتی ہے اور ان کا تلفظ بھی بہتر ہوتا ہے۔اگر چہ وہ اردو کو بحیثیت ایک مضمون کے نہیں پڑھتے مگر ان کا تدریسی ابلاغ وترسیل اردو میں ہے۔

ان مدارس میں کچھ ایسے مدرسے ہیں جو مرکزی نوعیت کے ہیں اور ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔اس لیے ان مدارس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے طلبا بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان ممالک کی زبان اردو نہیں ہے اور نہ وہاں کے سرکاری اسکولوں اور مدرسوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے اس کے باوجود وہاں کے طلبا جب ہندوستان کے مرکزی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور یہاں ایک مدت گزار کر واپس اپنے ملکوں کو جاتے ہیں تو اپنے ساتھ عالمیت اور فضیلت کی ڈگریوں کے ساتھ اردو زبان سے کسی قدر واقفیت اور شناسائی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ فضلا اپنے ملکوں میں ہندوستان اور بالخصوص اردو زبان کے خاموش سفیر بن جاتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کا شمار ہندوستان کے مرکزی مدارس میں ہوتا ہے۔ ان مدارس میں افریقی اور ایشیائی ممالک بالخصوص نیپال، بنگلہ دیش ، برما، افغانستان، ایران، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، یمن، لبنان اور افریقہ کے طلباء بڑی تعداد میں داخلہ لیتے ہیں اور

دینی تعلیم کے ساتھ اردو کی شدھ بدھ پیدا کر لیتے ہیں جبکہ بعض طلباء اردو لکھنے پڑھنے کی اچھی استعداد اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے ملکوں میں ہندوستانی وفود کی ترجمانی اور اردو کتابوں کے ترجمہ کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

۲۰۰۳ء میں عالمی نظام انصاف کے موضوع پر منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے راقم سری لنکا کی راجدھانی کولمبو گیا تھا۔ کانفرنس میں راقم کی ملاقات مالدیپ کے جسٹس عبدالرشید صاحب سے ہوئی وہ اردو جانتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدراس کے مدرسہ جمالیہ میں ہوئی تھی۔

۲۰۱۰ء میں راقم ترکی کی ایک کانفرنس میں مدعو تھا جو ترکی کے دارالخلافہ استنبول میں منعقد ہوئی تھی۔ راقم کی ملاقات جناب یوسف قراچہ سے ہوئی جو دالعلوم ندوۃ العلماء کے قدیم فضلا میں تھے اور ترکی میں تعلیمی و تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ اردو کی دینی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کر چکے تھے، انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی متعدد کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف ہند اسلامی ثقافت بلکہ اردو زبان کی علمی خدمت انجام دی ہے۔ شہر استنبول کے اسلامی مرکز دارالحکمہ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، یہاں متعدد ایسے فضلا سے ملاقات ہوئی جو ہندو پاک کے دینی مدرسوں سے فارغ تھے اور اردو زبان سے واقف تھے۔

اسی طرح راقم نے ۲۰۱۱ء میں مشہد اور تہران کی زیارت کی وہاں متعدد ایسے علماء سے ملاقات ہوئی جو اردو زبان سے واقف تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے اردو سے فارسی زبان میں متعدد علمی کتابوں کے ترجمے کیے تھے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ حضرات دارالعلوم زاہدان کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس مدرسہ کو دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فاضل مولانا عبدالعزیز قاسمی نے قائم کیا تھا۔ یہاں فارسی کے علاوہ اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح کا دینی مدرسہ شیستان میں بھی قائم ہے۔

شہر قم ایران کا علمی اور مذہبی مرکز ہے، وہاں جوزۂ علمیہ معروف دینی درسگاہ ہے۔ اسی درسگاہ میں امام خمینی مدرس تھے، یہاں ایرانی علماء کے علاوہ ہندوستانی علماء بھی درس دیتے تھے اور ان میں بہت سے وہ مدرس تھے جو اردو زبان میں بھی درس دیتے تھے اور ان سے ہندو پاک کے طلبا درس لیتے تھے۔ انہی میں مولانا سید علی نقی صاحب تھے جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

پڑوسی ملک نیپال میں مدارس اور مساجد کا قابل لحاظ نظام ہے۔ وہاں کے مدرسین اور ائمہ زیادہ تر ہندوستانی مدارس کے فضلاء ہیں، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، جامعہ سلفیہ بنارس اور دیگر ہندوستانی مدراس کے فارغین نیپال میں اسلامی علوم کی اشاعت کے علاوہ اردو زبان کی بھی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بہت سے فضلا نے نیپالی زبان میں اردو کتابوں کے ترجمے کیے ہیں اور بہت سوں نے اردو میں طبع زاد کتابیں رقم کی ہیں۔ نیپال میں جو دینی مدرسے قائم ہیں مثلاً مدرسۃ الاصلاح رام نگر بھوٹہا، درسگاہ اسلامی براٹ نگر، جامعہ اسلامیہ جھنڈا نگر، جامعۃ البنات بلکوا بازار، مدرسہ حسینیہ رمول سرہاد وغیرہ ان سب میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ وہاں بچے نیپالی زبان کے علاوہ اردو زبان بھی

سیکھ لیتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں ابتدا ہی سے لسانی تعصب جاری ہے۔ سرکاری زبان بنگالی ہے اور اردو زبان کو ملک بدر کیا گیا ہے، مگر دینی مدارس میں اردو زبان کسی قدر زندہ ہے۔ بڑے مدارس میں بنگالی کے علاوہ اردو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ گوکہ دینی مدارس کا ذریعہ تعلیم بنگالی ہے۔ مگر ان میں بہت سے مدارس کے معلمین ہندوستانی مدرسوں کے فضلا ہیں اس لیے اردو زبان سے ان کی ضروری واقفیت ہے، ان میں سے بعض فضلا نے درسی کتابوں کی اردو شرح کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس شروح کے مولفین ہندوستانی علماء ہیں۔

یمن، لبنان، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں ایک قابل لحاظ تعداد ہندوستانی مدرسوں کے فضلاء کی ہے جو اردو سمجھتی اور بولتی ہے، بعض تو ایسے فضلاء ہیں جو ان دینی مدرسوں سے فراغت کے بعد ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے واپس گئے اور اپنے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان میں راقم کے متعدد شاگرد شامل ہیں۔ یمن کے ایک اسکالر مولانا عبدالرحمٰن الکاف مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں انہوں نے یمن میں رہتے ہوئے اردو کو زندہ رکھا ہے۔ وہ علمی مضامین اردو میں لکھتے ہیں اور ان کے مضامین ہندوستان کے علمی رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔

افغانستان کو طالبان کی وجہ سے مغربی ممالک نے بدنام کیا ہے اور طالبان کا رشتہ دارالعلوم دیوبند سے جوڑا جاتا ہے، یہ کلی طور پر درست نہیں۔ البتہ افغانستان میں دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ موجود ہیں اور وہاں دینی تعلیم کے علاوہ اردو زبان کی اشاعت کر رہے ہیں جبکہ بڑی تعداد ان فضلاء کی ہے جو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور مدرسہ اشرفیہ لاہور کے تعلیم یافتہ ہیں۔

سعودی عرب میں دینی تعلیم اور عصری تعلیم کا اپنا نظام رائج ہے مگر آزادئ ہند سے پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں متعدد ایسے مدارس تھے جن کے منتظمین اور معلمین ہندوستانی مدارس کے فضلا تھے، ان مدارس کی باقیات صالحات میں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ ہے، یہاں کے معلمین کی اکثریت ہندوستانی مدارس کے فضلا کی ہے، خاص بات یہ ہے کہ عربی کے علاوہ اردو زبان کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، یہ مدرسہ حج وعمرہ کے لیے جانے والے ہندو پاک و بنگلہ دیش کے زائرین کی فقہی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

افریقی ممالک کے متعدد شہروں خاص طور پر جوہانس برگ میں اردو بولنے اور سمجھنے والے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں جہاں ہندوستان کے تاجروں اور تارکین وطن کا رول ہے وہاں دینی مدارس کا بھی ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں ہندوستانی مدارس کے بہت سے فضلا موجود ہیں جو تعلیمی و ثقافتی خدمات انجام دینے کے ساتھ تجارت ومعیشت میں بھی آگے ہیں جبکہ بعض پارلیمنٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے ہیں۔ ان فضلاء نے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے ہیں جہاں انگریزی کے ساتھ اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مدرسے گجراتی تارکین وطن نے قائم کیے ہیں۔ ان مدارس میں دارالعلوم زکریا جوہانس برگ، جامعہ اسلامیہ آزاد ول جوہانس

برگ، دارالعلوم مسیح الامت روشنی، جوہانس برگ، دارالعلوم نیوکاسل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان مدارس میں ابتدائی تعلیم سے لیکر دورۂ حدیث، افتا اور تخصص فی الحدیث کی تعلیم ہوتی ہے، یہاں کے مقامی طلباء کی مادری زبان اردو نہیں ہے مگر حدیث پڑھنے والے تمام طلباء کو پہلے اردو زبان سیکھنی ہوتی ہے، اسی طرح دیگر مدارس میں بھی اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدارس کے بیشتر اساتذہ دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم کراچی کے فضلا ہیں اور عربی کے ساتھ اردو میں تعلیم دیتے ہیں۔

یوروپی ممالک میں برطانیہ وہ ملک ہے، جہاں ۲۵ دارالعلوم یعنی بڑے دینی مدارس قائم ہیں۔ ان میں دارالعلوم ڈوزبری، داالعلوم مانچسٹر، دارالعلوم لیسٹر اور دارلعلم والہدیٰ بلیک برن شامل ہیں۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی مادری زبان گجراتی اور انگریزی وغیرہ ہیں، مگر ان مدراس کے زیادہ تر فضلاء ہندو پاک کے دینی مدارس کے فارغین ہیں، وہ اردو تعلیم دیتے ہیں اور انگریزی سماج کے بچوں میں اردو زبان وادب کو فروغ دیتے ہیں۔ برمنگھم شہر میں بعض بڑی مسجدوں میں مدرسے قائم ہیں اور وہاں بھی اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ راقم نے ۲۰۰۹ء میں انگلینڈ کے سفر میں بعض بڑے مدارس کا دورہ کیا ہے اور یہاں کے اساتذہ اور طلباء سے خطاب بھی کیا ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلباء انگریزی کے ساتھ بہت حد تک اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ انگلینڈ کے ان مدارس سے انگریزی کے علاوہ اردو میں رسالے اور کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ بعض فضلا نے اردو کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

میں نے بعض انگریزوں کو دیکھا ہے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد دینی مدرسہ میں داخلہ لیا اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اردو زبان سے اتنی واقفیت پیدا کر لی کہ وہ اردو سمجھنے اور بولنے لگے۔

مدارس کے فضلاء برطانیہ کے علاوہ امریکا میں بھی پہونچے ہیں اور وہاں دینی تعلیم کی مسند بچھائی ہے۔ اسلامک سنٹر کے نام سے جو دینی تعلیم کے مراکز کام کر رہے ہیں ان میں ایک تعداد ان مدارس کی ہے جن کے منتظمین یا مدرسین ہندوستانی مدارس کے فضلا ہیں اور وہاں انگریزی کے ساتھ اردو زبان میں تعلیم دیتے ہیں اور اردو کی عمومی اشاعت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ انہی حضرات میں دارالعلوم دیوبند کے شعبہ قرأت کے ایک سابق استاد قاری عبداللہ سلیم صاح بھی ہیں جو دارالعلوم شکاگو کے منتظم اور مدرس ہیں۔ امریکہ کے دیگر شہروں میں جو دینی مدارس قائم ہوئے ہیں وہاں بھی انگریزی کے ساتھ اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح دیارِ غیر میں اردو زبان نے جو جگہ بنائی ہے اور جو اثرات پیدا کیے ہیں ان میں اہم رول دینی مدارس اور ان کے فضلا کا ہے۔

بیرونی ممالک میں اردو کی اشاعت وترویج کے لیے اگر کوئی جامع پروگرام بنایا جائے تو ان فضلاء مدارس کو اردو زبان کی تدریس کے خصوصی تربیتی کورس کے نظام سے گزار کر اردو کی موثر اور منصوبہ بند خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور اردو کو عالمی زبان بنانے میں مدارس اور ان کے فضلاء کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

فارغین مدارس کی موجودہ صورتحال اور مطلوبہ کردار
ملک وملت کے تناظر میں

محمد انس فلاحی سنبھلی.....ریسرچ اسکالر: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

ملت اسلامیہ کا یہ امتیازی اور خصوصی پہلو ہے کہ اسے جو قرآن عطا کیا گیا ہے۔اس کا آغاز ہی اقرأ (پڑھنا) سے ہوتا ہے۔تعلیم وتعلّم، درس وتدریس، مشق وتمرین اور سیکھنا سکھانا ہی امت پر اولین فریضہ ہے۔ چونکہ علم کے بغیر معرفت خداوندی حاصل نہیں ہوسکتی۔یہی وجہ ہے کہ ملت میں بعثت نبویؐ سے ہی تعلیم وتعلّم میں اشتغال رہا ہے اور اس کے طفیل میں بڑے بڑے دانشورا ور مفکرین پیدا ہوئے۔جنھوں نے اپنے مسند درس سے ہزروں کی تعداد میں تشنگان علم کی پیاس بجھائی ہے۔ اور لازوال علم وحکمت کے موتی اور گوہر نایاب کو اپنی تصنیفات وتالیفات میں سمودیا ہے۔

مدرسہ مفہوم اور تاریخ:

درس وتدریس کی جگہ کو مدرسہ کہتے ہیں۔ملت میں مدرسہ کی بنیاد حضورؐ کے وہ ارشادات بنے جن میں علم دین کے حصول کیلئے ترغیب دی گئی ہے اور اس راہ میں نکلنے والے کو برکت وثواب کی بشارت سنائی گئی ہے۔حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: **مامن رجل سلک طریقا یطلب فیه علما الاّ سهل الله له به طریقا الی الجنة ومن ابطاء به عمله لم یسرع به نسبه** (۱) ''جوآدمی بھی علم کی خاطر سفر کرے گا تو اللہ تعالی اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردے گا''۔

یہی وجہ تھی کہ مسجد نبویؐ کے باہر چبوترے پر تشنگان علم بیٹھے رہتے تھے اور وہیں انہوں نے اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔تاریخ ان کو اصحاب صفہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ وہی سب سے پہلا مدرسہ ہے۔

مدارس کا آغاز

مدرسہ نظامیہ بغداد یہ (۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) (جسے معروف مورخ فلپ ہٹی نے عظیم اسلامی یونیورسٹی قرار دیا ہے) سے باضابطہ درس گاہ کی شکل میں یہ نظام تعلیم جاری ہوا اور اس کو مروج ہوئے کم وبیش ۹ صدیاں گزر چکی ہیں۔

مدرسہ نظامیہ (☆ حاشیہ دیکھئے) پہلا ایسا مستقل ادارہ ہے جو خالصتاً تعلیم کے فروغ کی غرض سے ادارہ جاتی سطح پر قائم کیا گیا، اس سے قبل قائم ہونے والی درسگاہیں زیادہ تر مساجد کے ساتھ ہوتی تھیں جن میں درسگاہ مسجد نبویؐ (۱ھ) مسجد کوفہ (۱۷ھ) جامع عمرو بن العاص قاہرہ (۲۰ھ) جامع منصور

بغداد (۱۴۵ھ) اور جامعہ قرویین مراکش (۲۵۴ھ) وغیرہ بطور خاص نمایاں ہیں۔ مصر، بغداد، دمشق کے علاوہ قرطبہ و غرناطہ میں یہی نظام تعلیم مسلمانوں میں رائج رہا ہے۔(۲)

ہندوستان میں ساتویں صدی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی سے مدارس کے قیام کا آغاز ہو گیا تھا۔ چنانچہ ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے جو وہاں کا حکمراں تھا ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ مشہور عالم ومصنف قاضی سراج (متوفی ۶۵۸ھ) کا بیان ہے کہ اس مدرسہ کا انتظام وانصرام ان کے سپرد تھا۔ آٹھویں صدی ہجری تک ہندوستان میں اسلامی مدارس قائم کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ مقریزی کی روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ ۔۷۵۲ھ) کے عہد حکومت میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے۔ مدارس کے لئے شاہی خزانہ سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک قرآن مجید کی حافظ وعالم ہوتی تھیں۔ مدراس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ معقولات اور ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔(۳)

مسلم عہد میں علم ایک اکائی تھی علم دین اور دنیوی وعصری علم کی تقسیم کی قطعاً کوئی روایت نہیں ملتی۔ اس عہد میں مدارس دونوں علوم یعنی دینی اور عصری علوم کے جامع ہوتے تھے۔ یہ تفریق ہرگز نہیں تھی کہ یہ دینی مدرسہ ہے اور یہ عصری مدرسہ یا تعلیم گاہ ہے۔ چنانچہ وہاں طلبہ قرآن وسنت، حدیث وفقہ کے ساتھ ساتھ طب، سماجیات، معاشیات، کیمیا، فلکیات، نباتات، حیوانات اور فلسفہ ومنطق کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ لیکن لارڈ میکاولے کے استعماری تصور علم اور نصاب تعلیم کو ۱۸۳۵ء میں لاگو کرنے کے بعد اس جامع روایتی نظام تعلیم کو نہ صرف کلی طور پر نظر انداز کر دیا گیا (۴) بلکہ اسے ذہن سے بھی ختم کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں مسلمانوں نے از خود نصاب تعلیم کی اس تفریق کو گوارا ہی نہ کیا بلکہ اس پر رضامند بھی ہو گئے۔ اب علم کی دو تقسیمیں ہو گئیں دینی تعلیم اور دنیوی اور عصری تعلیم۔

مدارس کے قیام کا اصل مقصد:

مدارس کے قیام کے مقصد کو جاننے کے لئے موجودہ ہندوستان میں قائم ہونے والے چند بڑے اور نمائندہ اداروں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تاکہ مدارس کے قیام کے مقاصد کی تفہیم میں تسہیل ہو۔ نمائندہ اداروں میں دارالعلوم دیوبند (۱۸۶۶ء) دارالعلوم ندوۃ العلماء (۱۸۹۶ء) اور جامعۃ الفلاح (۱۹۶۲ء) ہیں۔ ان مدارس کے قیام میں علماء کی بڑی جدوجہد رہی ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ تینوں مدارس کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والی کمی اور ملی تہذیب وثقافت کے احیاء کے لئے قائم کیا گیا۔ ندوۃ العلماء اور جامعۃ الفلاح کا قیام اس لئے عمل میں لایا گیا تاکہ ان میں ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو قدیم وجدید کا سنگم ہو۔

دارالعلوم دیوبند:

دارالعلوم کے قیام کا تاریخی پس منظر ذکر کرتے ہوئے مرتب ''تاریخ دارالعلوم'' سید محبوب رضوی رقمطراز ہیں:

''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب دہلی اجڑی اور اس کی سیاسی بساط الٹ گئی تو دہلی کی علمی مرکزیت بھی ختم ہو گئی اور علم ودانش کا کارواں وہاں سے رخت سفر باندھنے

پر مجبور ہوگیا اس وقت کے اہل اللہ اور خصوصیت سے ان بزرگوں میں جو اس خونیں انقلاب سے خود بھی گذر چکے تھے اور مسلمانوں کی نعشوں کو خاک وخون میں تڑپتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ یہ فکر و اضطراب لاحق ہوا کہ علم ومعرفت کے اس کارواں کو کہاں ٹھکانہ دیا جائے۔

اس وقت بنیادی نقطہ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کیلئے ایک دینی اور علمی درس گاہ کا قیام ناگزیر ہے، اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء خاص مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حاجی محمد عابدؒ نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہئے''۔(۵)

۵ محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ کو چھتہ کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسم تقریب کے بغیر دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا۔(۶) دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لاگیا ان کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستور اساسی میں حسب ذیل بیان کی گئی ہے۔

۱۔قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد اور کلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲۔اعمال واخلاقِ اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ ودفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر وتقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیرالقرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴۔حکومت کے اثرات سے اجتناب اور احتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵۔علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔(۷)

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے احیاء کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا اور جس کے قیام کے سلسلے میں اکابر دیوبند نے انتھک جدوجہد کی۔

ندوۃ العلماء :

مسلمانوں کا ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جس کے ابتدائی دور کا مولانا شبلی کی مذہبی، تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ادارہ ۱۸۹۶ء میں مغربی عقائد رکھنے والے سرکاری ملازمین، علماء اور صوفیاء کی کوششوں سے لکھنؤ میں قائم ہوا۔(۸)

تحریک ندوۃ العلماء کے روح رواں مولانا محمد علی مونگیریؒ کی صراحت کے مطابق قیام دارلعلوم کے چار مقاصد تھے۔

۱۔علوم وفنون کی تکمیل

۲۔علوم دینیہ خصوصا علم کلام میں کمال پیدا کرنا تاکہ الحاد و دہریت کا مقابلہ کیا جاسکے علم فقہ میں تبحر پیدا کرنا تاکہ عبادات ومعاملات میں علماء کے فتاوی مستند وواجب العمل ہوں۔

۳۔مسلمانوں میں اسلامی اخلاق اور شائستگی پیدا کرنا اور ان کو عمدہ اطوار اور عادتوں کا خوگر بنانا۔

۴۔طلبہ میں اعلی ظرفی وفراخ حوصلگی پیدا کرنا اور انہیں پست حوصلگی اور بے توقیری سے بچانا۔(۹)

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے انیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں خطبہ صدارت میں قیام ندوہ کے مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' اصلاح نصاب ورفع نزاع کو اپنے مقاصد میں داخل کرنے سے ندوۃ العلماء کا مقصد یہی تھا کہ برباد کن مشاغل سے توجہ ہٹا کر ضروری امور کی جانب مائل کرے ،نصاب میں ایسی ترمیمیں کی جائیں جن کے ذریعہ سے حالیہ ضرورتوں کو پورا ہونے کا سامان ہو۔(۱۰)

پرفیسر رشید احمد صدیقی نے ندوۃ العلماء کو علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے مابین خلیج کو پورا کرنے کیلئے پل قرار دیا ہے۔(۱۱)

یہ ہیں وہ مقاصد اور پس منظر جس کے پیش نظر ندوۃ العلماء کا قائم کیا گیا جس میں مختلف مذاہب کے علماء نے بہم مل جل کر اور باہمی مشورے وتعاون کے بعد اس کو نئے نصاب تعلیم کے مطابق قائم کیا۔

جامعۃ الفلاح :

یہ مدرسہ مختلف مراحل سے گزرتا ہو۱۹۶۲ء میں جامعۃ الفلاح کی شکل میں متعارف ہوا۔ جامعہ کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۲۹ جون ۱۹۶۴ء کے اجلاس انتظامیہ میں جامعۃ الفلاح کے مندرجہ ذیل اغراض ومقاصد طے کئے گئے۔

☆ایسے افراد تیار کرنا۔۔۔

۱۔جو قرآن وسنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

۲۔جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

۳۔جو اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔

۴۔جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو۔

۵۔ جو گروہی ، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

☆ایسا نصاب زیر عمل لانا جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہو اور جو جامعہ کی اساس سے ہم آہنگ ہو۔

☆اسلام کی خدمت کیلئے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق فکری، عملی اور تحقیقی مواد فراہم کرنا۔

☆فنی، تکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم کا اس طرح نظم کرنا کہ جامعہ کا بنیادی مقصد متاثر نہ ہو۔

اغراض ومقاصد کی یہ مفصل تشریح دارصل اس جامع مقصد ہی کی تفسیر ہے جو۱۳جولائی ۱۹۶۱ء کو جامعہ اسلامیہ کی مجلس تعلیمی نے قصبہ کی مغربی مسجد میں طے کیا تھا۔(۱۲)

فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار :

دینی مدارس کے فارغین کا مطلوبہ کردار کیا ہو، نیز وہ کیا کام انجام دیں،ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں،اس ضمن میں چند بنیادی اور اہم باتیں یہ ہوسکتی ہیں۔

اخلاص و للہیت :

سب اہم اور ضروری چیز جو کسی بھی عمل کی قبولیت کیلئے شرط ہے وہ اخلاص ہے ۔ اگر کسی نیک عمل کی پشت پر نام ونمود یا ریاکاری، جاہ ومنصب کی طلب ہو تو وہ عمل عنداللہ قابل قبول نہ ہوگا۔اس لئے فارغین مدارس اپنے علم کو نام ونمود، جاہ ومنصب کی طلب کا ذریعہ نہ بنائیں ۔اپنے اندر خوف خدا اور خوف آخرت کو مستحضر رکھیں۔ان کا مقصود ومطلوب رضائے الٰہی ہو۔ سماجی، ملی اور ملکی سرگرمیوں میں بھی حصہ صرف رضائے الٰہی کی خاطر لیں ۔اپنی تحریر وتقریر کو بھی محض اشاعت دین کا ذریعہ بنائیں۔اس سے اپنی بڑائی منوانا یا اپنے آپ کو سماجی سطح پر بڑا

کہلوانے کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ المیہ یہ ہے کہ یہ چیز فارغین مدارس میں تو کیا بڑے بڑے علماء میں بھی نظر نہیں آتی، اسی لئے جب کسی کام میں اونچ نیچ کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر اخلاص وللّٰہیت مفقود ہوتی ہے۔ اسی لئے اپنے اندار اخلاص وللّٰہیت پیدا کریں۔

علم میں گہرائی اور گیرائی:

اپنے مطالعہ میں وسعت پیدا کریں۔ صرف درسی کتابوں کے مطالعہ واستفادہ کو ہی کافی نا سمجھیں بلکہ غیر درسی مطالعہ کو اپنی علمی غذا کے لئے ضروری سمجھیں غیر درسی مطالعہ ہی اصلا طالب علم کے اندر تفکر وتدبر، تحقیق وتنقید کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد یہ تصور نا کریں کہ ہم نے آٹھ یا دس سال لگا کر بہت پڑھ لیا۔ بلکہ مزید تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے ایسی اکیڈمیز کا رخ کریں جہاں رہ کر یکسوئی کے ساتھ خارجی کتابوں کا مطالعہ کرسکیں۔ یا پھر یونیورسٹی کا رخ کریں۔ آج کی اس تیز رفتار دنیا میں فارغین مدارس کے لئے بے شمار مواقع ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ الغرض علم میں گہرائی وگیرائی کے لئے متنوع موضوعات ومضامین کا مطالعہ کریں، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور سائنسی علوم کو بھی اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ معروف ومستند اخبارات ورسائل سے بھی استفادہ کرتے رہیں۔

وسعت قلب ونظر:

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ مدارس کے فارغین تنگ نظر اور خشک مزاج ہوتے ہیں۔ کسی سے کوئی معاملہ ہوجائے تو وہ اسے اپنی ذات کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ عصری تعلیم گاہوں کے طلبہ کے سلسلے میں وہ بہت متشدد ہوتے ہیں۔ انہیں وہ بے دین اور بے راہ رو سمجھتے اور گردانتے ہیں۔ چونکہ ان کے خیال میں دین اور دینی تعلیم انہوں نے ہی پڑھی اور سمجھی ہے اور وہ ہی اس کے اصل وارث ہیں۔ اسی لئے وہ دوسروں کو خاطر میں لاتے ہی نہیں!۔ ٹوپی، کرتہ، پجامہ کو وہ دینی شناخت تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس لباس پہننے والے کو وہ عجیب وغریب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مشاہدہ میں یہ بات بھی بارہا آتی ہے کہ جب کوئی یونیورسٹی کا طالب علم یا پروفیسر کسی دینی موضوع پر گفتگو کرتا ہے یا دین کی دعوت دیتا ہے تو تنگ نظر فارغین مدارس اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑجاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی دانست میں دین کی تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ داعی ومبلغ ٹوپی، کرتہ، پجامہ میں ملبوس ہو۔ اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ وہ اپنے کو وسعت قلب، وسعت نظر اور خوش مزاج بنائیں انا ور ذاتیات سے بالاتر ہوکر ملی مفاد کے لئے کام کریں۔ دین کا صحیح تصور از خود سمجھیں اور ملت کو اس سے روشناس کرائیں۔

بصارت وبصیرت:

مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ فارغین مدارس دنیا کے احوال وکوائف سے نابلد ہوتے ہیں۔ زمین سے اوپر اور زمین سے نیچے کی باتیں ہی وہ جانتے ہیں جنت ودوزخ کے بارے میں تو وہ خوب جانتے ہیں لیکن زمین پر کیا ہورہا ہے، ملک وملت کن مسائل سے دوچار ہیں، سماج ومعاشرے میں کیا واقعات وحوادث رونما ہورہے ہیں، دنیا میں کیا ترقی وتنزلی ہورہی ہے وہ ان کے کانوں کو چھو کر بھی نہیں گزرتا۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ وہ نہ کے برابر کرتے ہیں، ٹی وی پر نیوز دیکھنا تو ان کے

حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا چونکہ ان کے یہاں ٹوٹی وی دیکھنا مطلقا حرام ہے۔(حالانکہ بعض طلبہ فلم بینی کے بھی عادی نظر آتے ہیں)اس لئے انہیں حالات سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی۔ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی اپنے اندر پیدا کرنی ہوگی، اگر وہ زمانہ شناش نہ ہوں گے تو بھلا اسلام کی کیا اشاعت وترویج کرینگے!۔

دعوت دین :

اسلام ایک دین دعوت ہے،اس کی جملہ خصوصیات میں سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔وہ دنیا کے تمام انسانوں کو اپنا پیروکار بنانا چاہتا ہے اسلام اپنے ماننے والوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ دعوت دین کا کام انجام دیں۔امت مسلمہ کو خیر امت کا لقب بھی اسی بنا پر دیا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ارشاد باری تعالی ہے **کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون بالله** (۱۳)''اب دنیا میں وہ بہترین گروپ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت وصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے،تم نیکی کا حکم دیتے ہو برے کاموں سے روکتے ہو،اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

دعوت دین کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی پوری امت پر فرض ہے۔چاہے وہ علماء وحکماء ہوں یا عوام،البتہ علماء کی ذمہ داری زیادہ ہے چونکہ وہ علوم نبوت کے وارثین ہیں اور قرآن وسنت کے جاننے والے ہیں اس لئے انہیں دعوت دین کے سلسلے میں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔بیشتر فارغین مدارس یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ دعوت دین غیر مسلموں میں ثانوی کام ہے اول اور اہم کام مسلمانوں کی اصلاح ہے۔اسی نقطہ نظر کی وجہ سے فارغین مدارس کی اکثریت غیر مسلموں میں دعوت کے تعلق سے غافل یا دانستہ طور پر اس سے دور رہتی ہے۔اس لئے فارغین مدارس کو دعوت کی اہمیت وافادیت کو سمجھنا چاہیے اور حتی الامکان اس کے لئے جدوجہد کرنا چاہیے۔

معاشرتی اصلاح:

ہمارے معاشرے کی جو صورتحال ہے اس سے ہر خاص وعام واقف ہے۔اس موضوع پر بیشتر لوگ لکھتے اور بولتے ہیں، البتہ نتیجہ لاحاصل رہتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں منظّم انداز سے کوئی کام نہیں ہورہا ہے، فارغین مدارس اس سلسلے میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں، وہ اپنے مقام پر ایک ٹیم برائے اصلاح معاشرہ بنائیں اور معاشرے میں رائج برائیوں کی اولین فرصت میں نشاندہی کریں اور ان کے سدباب کے لئے موزوں ومناسب لائحہ عمل بنائیں، برائیوں میں ملوث افراد سے تنہائی میں ملیں،انہیں برائی کے نتیجہ وانجام سے باخبر کریں گفتگو کا انداز ناصحانہ ہو، حاکمانہ اور جابرانہ ہرگز نہ ہو، ورنہ اس سلسلے کوئی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔

سماجی وملی سرگرمیوں میں حصہ :

ہر فرد کسی نا کسی سماج یا قوم وملت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اپنے سماج اور قوم وملت سے محبت رکھتا ہے، فارغین مدارس بھی سماج سے تعلق رکھتے ہیں،اس لئے انہیں سماجی،ملی اور ملکی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے۔ملک وملت میں ہونے والے اصلاحی وتعمیری کاموں کے سلسلے میں سوچتے رہنا اور کچھ کرتے رہنا چاہیے۔کیونکہ ایک ملت کا فرد اور ایک ملک کا شہری ہونے کی حیثیت سے یہ ان پر فرض بھی ہے کہ وہ ملک وملت کے تعلق سے فکرمند رہیں اور تعمیر وترقی کی راہ ہموار کریں۔

ملکی مسائل سے واقفیت اور اصلاحی کوششیں: ہندوستان کا شہری ہونے کی نسبت سے ہم پر یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ملکی حالات سے باخبر رہیں، ملک کے خارجی وداخلی مسائل پر نگاہ رکھیں۔ ہمارا ملک ہندوستان آج جن بڑے مسائل سے دوچار ہے وہ یہ ہیں،معاشی بدحالی، غربت وافلاس ، مہنگائی ،کرپشن اور دہشت گردی ۔فارغین مدارس کی ہندوستان کا شہری ہونے کی حیثیت سے یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مذکورہ مسائل کے تعلق سے اسلامی حل پیش کریں ۔اوراس کے لئے عوام میں بیداری پیدا کریں، معاشی بدحالی کے خاتمہ کا جوحل اسلام نے پیش کیا ہے اس کو حکمرانوں کے سامنے پیش کریں۔ملکی مسائل کے حل کیلئے ذمہ داران کو مفید مشورے دیں اور ان مسائل کو حل کرنے کیلئے حتی الامکان خود بھی کوشش کریں۔

فارغین مدارس کی انجمن :

فارغین مدارس کی ایک مشترکہ انجمن اور تنظیم ہونی چاہیے تا کہ باہمی ربط وتعلق،الفت ومحبت اور گفت وشنید کی راہ ہموار ہو سکے نیز وہ باہم مل جل کر ملت اسلامیہ کیلئے نتیجہ خیز کوششیں کرسکیں۔ اگراس طرح کی کوئی تنظیم یا ایسا کوئی پلیٹ فارم بن جائے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کے ذریعہ ملی وحدت اوراتحاد بین المسلمین کی راہ ہموار ہوگی۔

فارغین مدارس کی موجودہ صورتحال :

یہ بات مسلمہ حقیقت رکھتی ہے کہ ماضی میں مدارس ہی نے ملک وملت کی خاطر جانیں قربان کی ہیں۔مدارس سے ہی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے دین کی خاطر اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی ۔ان کا لمحہ لمحہ دین کی خاطر صرف ہوتا تھا۔جس کی شہادتیں تاریخی کتابیں پیش کرتی ہیں ۔البتہ موجودہ فارغین مدارس کی صورتحال قابل تشویش اورافسوسناک ہے۔مدرسہ میں آٹھ دس سال تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ اس لائق نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کے سامنے دین کا صحیح تصور پیش کرسکیں، وجہ یہ ہے کہ وہ خود ہی اس سے نابلد ہوتے ہیں۔فارغین مدارس کا جائزہ لیا جائے تو چند چیزیں سامنے آتی ہیں۔

مسلکی تعصب وتشدد:

مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ میں بالعموم مسلکی تعصب وتشدد پایا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہر مدرسہ اپنا ایک الگ مسلک اور نقطہ نظر رکھتا ہے۔اور مدرسے کے منہج وطریقہ کے مطابق پڑھنے کے بعد طالب علم کا ذہن اپنے مسلک کے تعلق سے متشدد نہیں ہوگا تو پھر اور کیا ہوگا ؟۔ملی انتشار وافتراق کا ایک اہم سبب ایسے ہی لوگ بنتے ہیں چونکہ وہ اپنے مسلک کے علاوہ دوسروں کو ناحق اور باطل تصور کرتے ہیں۔

ناقص تعلیم ومطالعہ :

مدارس کا نصاب تعلیم ایسا ہے کہ طالب علم نہ تو درسیات میں ہی درک حاصل کر پاتا ہے اور نہ ہی خارجی مطالعہ کا ذوق وشوق اس کے اندر پیدا ہو پاتا ہے۔خارجی مطالعہ کا جہاں تک تعلق ہے مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ بعض طلبہ آٹھ دس سال کے دوران چند بنیادی کتابیں بھی نہیں پڑھ پاتے ہیں۔مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد نہ تو وہ اسلامیات ہی میں پختہ ہوتے ہیں کہ وہ درس وتدریس کا فریضہ انجام دے سکیں اور نہ ہی عصری تعلیم گاہوں میں ہی پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر طلبہ مکتب ، مدرسہ اور مساجد کا رخ کرتے ہیں، بعض گھر کی مصروفیات اور مجبوریوں کی بنا پر مزید تعلیم ترک کردیتے ہیں۔

احساس کمتری :

وہ طلبہ جو مدارس سے فارغ ہونے کے بعد یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں ان میں بالعموم احساس کمتری پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ داخلہ کے بعد سب سے پہلے اپنی وضع وقطع ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ یہ احساس کمتری نتیجہ ہے اپنے علم میں ناپختگی اور ضعف ایمان کا، اس لئے وہ یونیورسٹی کے ماحول سے بہت جلد مرعوب ہوجاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبہ کا لب ولہجہ، فراٹے دار انگریزی اور جینس، ٹی شرٹ ان کی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے۔

مسائل ووسائل سے ناواقفیت :

فارغین مدارس میں ایک چیز یہ دکھنے میں آتی ہے کہ وہ نہ تو مسائل ہی سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مسائل کے حل کرنے کیلئے استعمال ہونے والے وسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ نہ انہیں معاشرتی مسائل، ملکی مسائل اور ملی مسائل سے واقفیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میں اپنا رول ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں، بیشتر تو ان وسائل سے واقف ہی نہیں ہوتے، استعمال کرنا تو دور کی بات ہے۔ بعض فارغین مدارس کے نقطہ نظر میں یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ وہ عصر حاضر سے لاتعلقی کو زھد وتقوی سمجھتے ہیں۔ معاشرہ سے کٹ کر رہنا، مدرسہ سے مسجد تک سمٹ کر رہنا ہی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ مدرسہ ومسجد ہی ان کی کل کائنات ہوتی ہے۔ اس میں درس وتدریس، وعظ ونصیحت اور دعاواذکار کرنا ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مذکورہ بالا صورتحال فارغین مدارس کی عمومی صورتحال کے کو دیکھ کر لکھی گئی ہے ورنہ مدارس سے فارغ ہونے والوں میں بااخلاق وباکردار، سنجیدہ، پختہ علم ومطالعہ اور صلاحیت والے طلبہ بھی ہوتے ہیں اور جو قوم وملت کی حتی الوسع خدمت انجام دے رہے ہیں۔

تبدیلی کیلئے لائحہ عمل :

فارغین مدارس کی موجودہ صورتحال میں تبدیلی لانے کے لئے ضروری ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم، نظام تعلیم میں جدت پیدا کی جائے۔ اس میں مناسب حذف واضافہ کیا جائے، مدارس کی ابتری صورتحال کا تذکرہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدارس کے اجزائے ترکیبی منتظمین، اساتذہ، طلبہ کا ذکر کرنے کے بعد ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ چنانچہ رقمطراز ہیں۔

''یہ تینوں مل کر مدارس کے زوال وانحطاط کا باعث بنے ہوئے ہیں، یہ سب عموما دینی روح، عمل، اخلاص، خشیت وانابت، اسلامی طرز حیات اور اخلاق فاضلہ سے تہی مایہ ہوگئے ہیں اور یہ صرف ان مدارس کا حال نہیں ہے جن میں جدید طرز تعلیم رائج ہوگیا ہے بلکہ جو اہل اللہ اور مشائخ کے قائم کردہ اور کسی صاحب نسبت بزرگ کے زیر نگرانی چل رہے ہیں''۔(۱۴)

نصاب تعلیم :

نصاب تعلیم ونظام تعلیم کے تعلق سے مولانا ابوکلام آزادؒ نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ'' آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے اس کا ذمہ دار صرف نصاب تعلیم اور نظام تعلیم ہے''(۱۵)۔ اگر یہ کہا جائے کہ فارغین مدارس کی موجودہ صورتحال کا اصل سبب نصاب تعلیم ونظام تعلیم

ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ مدارس میں ایسا نصاب رائج ہے جس میں طلبہ کے لئے کوئی کشش ہے اور نہ ہی وہ عصری ضروریات کو پورا کرسکتا ہے۔ صدیوں قبل لکھی گئی کتابیں آج بھی زیر درس ہیں، خشک منطق وفلسفہ کی بحثیں طلبہ کو مجبوراً اور جبراً پڑھائی جاتی ہیں ۔حالانکہ قدیم منطق وفلسفہ کی موجودہ دور میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ فقہ پر لکھی گئی قدیم زمانے کی کتابیں تاحال جاری ہیں ۔لیکن جدید مسائل جو ابھر رہے ہیں ان پر نہ تو مدارس میں کوئی بحث ہی کی جاتی ہے نہ اس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ البتہ چند شخصیتیں اس تعلق سے انفرادی طور پر کام کررہی ہیں حالانکہ یہ کام اجتماعی کوششوں کا طالب ہے۔ مضامین کا اتنا بوجھ لاد دیا جاتا ہے کہ طلبہ کسی ایک مضمون میں بھی کما حقہ درک پیدا نہیں کر پاتے ۔ اس لئے فی الفور مدارس کے پورے نصاب تعلیم کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور اس میں موزوں ومناسب تبدیلی عمل میں لائی جائے ۔ دینی علوم اور عصری علوم کی تفریق ختم کرکے مدارس کے نصاب میں قدیم صالح اور جدید نافع کو شامل کیا جائے ۔ ورنہ فارغین مدارس کی موجودہ ابتر صورتحال مزید ابتر ہوتی چلی جائے گی۔

ماہر فن اساتذہ کا تقرر کیا جائے :

نصاب تعلیم کی خامی کے ساتھ ساتھ مدارس میں اچھے اور قابل اساتذہ کا بھی فقدان ہے ۔ بالعموم غیر علمی، غیر معیاری اور غیر سنجیدہ اساتذہ تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جس کا اثر طلبہ کے علم وفکر اور عمل پر پڑتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس میں باصلاحیت اور صالح اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ ذمہ داران مدارس کو چاہئے کہ وہ اپنے سالانہ مصارف کی خاطر خواہ رقم اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے مختص رکھیں تاکہ با صلاحیت اساتذہ میسر ہوسکیں اور پورے انہماک کے ساتھ طلبہ کی علمی اور عملی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

تدریسی منہج میں تبدیلی :

مذکورہ بالا خامیوں کے ساتھ ایک خاص کمی مدارس میں تدریسی طریقہ کار ومنہج کی پائی جاتی ہے ۔ مدارس کے تدریسی طریقے میں نہ تو کوئی جان ہے اور نہ ہی کوئی کشش پائی جاتی ہے۔ مدرس کلاس روم میں آنے کے بعد طالب علم سے سبق پڑھواتا ہے۔ اس کے بعد خود ہی پڑھائے گئے سبق کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ اس طریقہ تدریس سے طلبہ کے اندر ذرا بھی علمی ذوق وشوق پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مدارس میں تدریسی منہج ویسا ہی ہو جیسا کالج اور یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اب تو جونئر ہائی اسکول میں بھی اسمارٹ کلاس شروع ہوگئے ہیں۔ ذمہ داران مدارس کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں جلد از جلد پیش رفت کریں۔

جدید ذرائع کا ابلاغ کا استعمال :

دینی مدارس میں بالعموم جدید سہولیات میسر نہیں ہیں ۔ یہ چیز اگر مدارس میں استعمال کی جانے لگے تو طلبہ کم وقت میں زیادہ سیکھ سکتے اور پڑھ سکتے ہیں Internet کی دنیا بہت وسیع ہے کسی بھی چیز کے بارے میں جاننا ہو تو ٹائپ کیجئے اور بٹن پر کلک کرتے ہی اس کے متعلق ساری معلومات فراہم ہوجائے گی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید ذرائع ووسائل کا استعمال مدارس میں طلبہ کے لئے فراہم کیا جائے۔

علمی ماحول پیدا کیا جائے :

فرد کی نشوونما پر ماحول کا بے حد اثر پڑتا ہے ماحول اگر خوشگوار،

علمی اور دینی ہے تو لامحالہ فرد کا مزاج نرم، علمی اور دینی ہوگا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو نتیجہ بھی اس کے مطابق ہوگا۔ طلبہ مدارس کے علمی ذوق وشوق کے لئے سم قاتل مدرسہ کا ماحول اور اساتذہ کی باہمی چپقلش ہے۔ وہاں نہ تو اساتذہ ہی درسیات کے علاوہ غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی طلبہ کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔ علمی ماحول کو پیدا کرنے کیلئے کیا چیزیں معاون ہوسکتی ہیں اس سلسلے میں مولانا وارث مظہری رقمطراز ہیں۔ ''غیر نصابی سرگرمیوں میں مختلف چیزوں پر توجہ اور ارتکاز کی ضرورت ہے۔ جیسے ماہرین اصحاب علم کے ذریعہ ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہانہ محاضرے کا پروگرام، تقریری مجالس کی طرح تحریری مقابلوں کا پروگرام، مختلف موضوعات پر اوپن سکشن کا اہتمام وانتظام ملک اور ملک سے باہر مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اہم اور علمی رسائل ومجلّات کی کیٹلاگ سازی اور طلبہ کو ان کی فراہمی مرکزی لائبریری میں ضروری اور بنیادی کتابوں کے ساتھ نئی شائع شدہ کتابوں کا ذخیرہ جن سے طلبہ باآسانی اور بروقت استفادہ کرسکیں اسی طرح طلبہ میں تحریری ذوق کو ابھارنے کے لئے سالانہ طلبہ کی تحریری کوششوں پر انعامات دینے کے علاوہ ان پر نمبرات بھی دیئے جائیں اور انہیں سالانہ مارک شیٹ میں شامل بھی کرنا چاہیے''۔(۱۶) نیز عصری درس گاہوں کے دانش ور حضرات کے لیکچرس رکھے جائیں تاکہ طلبہ ان لیکچرس سے مستفید ہوں اور مدرسہ کی فضا میں علم وآگہی پروان چڑھے۔

لسانیاتی تعلیم :

مدارس کے تعلق سے ایک المیہ یہ ہے کہ فارغین مدارس طویل عرصہ عربی زبان پڑھنے کے باوجود اس قابل نہیں ہو پاتے کہ وہ عربی میں گفتگو کرسکیں، عربی میں ایک مضمون لکھ سکیں، وجہ وہی ہے نصاب تعلیم اور طرز تعلیم کی خامی۔ اسلئے مدارس میں عربی زبان کے سلسلے میں ہونے والی تعلیم کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے اور اس میں پائی جانے والی خامیوں کو فی الفور دور کرنا چاہیے۔ نیز عربی زبان وادب کے ساتھ انگریزی، ہندی اور اردو زبان کی بھی تعلیم صحیح معنوں میں ہونی چاہیے۔ بعض مدارس میں تو اس سلسلے میں اچھی پیش رفت ہوئی ہے البتہ بقیہ مدارس اسی ڈگر پر چل رہے ہیں، زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں اضافی کلاسس چلائی جائیں۔ بالخصوص عربی وانگلش کے لئے ایک ایک گھنٹہ مختص کیا جائے تبھی اس سلسلے میں کوششیں بارآور ہوسکتی ہیں۔

حرف آخر

آخر میں یہ عرض ہے کہ مدارس جو دین اسلام کے قلعے ہیں اگر ان کے نصاب تعلیم کا بروقت حقیقت پر مبنی جائزہ نہیں لیا گیا اور اس کی اصلاح کے سلسلے میں غفلت برتی گئی تو اس کا خمیازہ ملت ہی کو بھگتنا پڑے گا۔ ملی زوال مزید سے مزید تر ہوتا جائے گا پھر وہی حال ہوگا جو اندلس میں ہوا وہاں اسلام کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا۔ بعد ازاں اس سلسلے میں کوئی سعی سود مند ثابت نہ ہوگی۔ اس لئے ذمہ داران کو چاہیے کہ باہم مل جل کر مدارس کی صورتحال تبدیل کرنے کیلئے سنجیدہ کوششیں کریں ورنہ پھر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر مزید صادق آئیگا۔

اُٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

حوالہ جات :

☆ یہاں یہ واضح رہے کہ مدرسہ نظامیہ اور درس نظامی دونوں الگ الگ چیزیں ہیں مدرسہ نظامیہ اسکول یا کالج کی شکل میں نظام الملک طوسی نے بنوایا تھا۔(نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ شیخ الشیوخ ابوسعد نیشاپوری کی تحریک پر بنایا۔ بروز منگل مہینہ ذی قعدہ مطابق ۴ اکتوبر ۱۰۶۵ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھ گیا۔عبدالرزاق صاحب کانپوری ''نظام الملک طوسی'' مطبوعہ کانپور پریس ۱۹۱۲ء ص ۶۴۷) اور درس نظامی نصاب تھا جو ملا نظام الدین نے بنایا تھا۔

۱۔سنن ابوداؤد حدیث رقم ۳۶۴۲

۲۔ حافظ حسن مدنی ''دینی مدارس میں تحقیق وصحافت ایک جائزہ'' محدث لاہور ستمبر ۲۰۰۴ء ج ۳۶ ش ۹ ص ۳

۳۔ سید محبوب رضوی، مرتب'' تاریخ دارالعلوم دیوبند'' مطبوعہ بھارت آفیسٹ ۱۹۹۲ء ص ۷۱،۷۲ جلد اول

۴۔حافظ حسن مدنی ''دینی مدارس میں تحقیق وصحافت ایک جائزہ'' محدث لاہور ستمبر ۲۰۰۴ء ج ۳۶ ش ۹ ص ۴

۵۔سید محبوب رضوی ،مرتب ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' مطبوعہ بھارت آفیسٹ ۱۹۹۲ء ص ۱۴۸،۱۴۹ جلد اول

۶۔ایضاً ص ۱۵۵

۷۔ایضاً ص ۱۴۲

۸۔ جامع اردو انسائکلو پیڈیا ص ۴۱۲ جلد دوم مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وادب

۹۔ڈاکٹر عبیداللہ فہد ''مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات'' مطبوعہ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ ۲۰۰۶ء ص ۶۱

۱۰۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ''ندوۃ العلماء اس عہد انقلاب میں اس کا کام اور اس کا پیغام'' مطبوعہ سلسلہ ندوۃ العلماء ۱۹۵۵ء ص ۸

۱۱۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ''عزیزان ندوہ'' کے نام مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ص ۱۶

۱۲۔ڈاکٹر عبیداللہ فہد ''مدارس اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات'' مطبوعہ ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ ۲۰۰۶ء ص ۹۶

۱۳۔سورۃ البقرۃ ۱۱۰

۱۴۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی ''مسلمانوں کی تعلیم''مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۲۰۰۶ء ص ۷۹

۱۵۔ بحوالہ ممشاد علی قاسمی'' تاریخ درس نظامی''مطبوعہ مجمع البحوث والاسلامیہ بلاسپور مظفرنگر (یوپی) بار دوم ۱۹۹۴ء ص ۷

۱۶۔ مولانا وارث مظہری'' مدارس میں تصنیف وتحقیق کی صورتحال کا ایک جائزہ''افکار ملی دہلی اکتوبر ۲۰۱۳ء ج ۲۸ ش ۱۰ ص ۴۹

☆☆☆

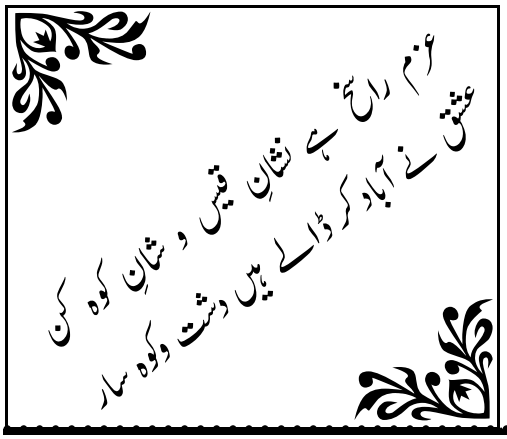

تذکرہ

شیخ عزّ الدین القسّام

(۱۹۳۵-۸۸۲ء)

تحریر: محمد البرکتہ ترجمہ: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

چند دن قبل (۱۴-۲۱ر نومبر ۲۰۱۲ء) صہیونی وجود نے پھر غزہ سیکٹر پر حملہ کیا، اس کے خلاف ناپسندیدگی اور ملامت کی آوازیں دنیا بھر سے اٹھیں، فلسطینیوں کے خلاف یہ صہیونی Holo Caust پہلا نہیں تھا، اللہ کرے کہ آخری ہو، اس سے پہلے وہ ۲۰۰۸-۲۰۰۹ء میں غزہ کو تباہ و برباد کر چکا ہے، لیکن غزہ صبر وسکون سے سرحد پر جما رہا، شکست کھائی نہ سر جھکایا، لڑکھڑایا نہ مرا، اسلامی مزاحمتی تحریک (حماس) کے فوجی بازو کے قسّام دستے جو فلسطین میں دن رات سرگرم رہتے ہیں وہ شہید شیخ عزالدین القسّام کے نام سے منسوب ہیں، یہ مجاہد ہیرو کون تھے جن کی وفات (۲۰ر نومبر ۱۹۳۵ء) کی ستّر ویں برسی کا یہ سال ہے؟

شیخ عزالدین القسام ہماری معاصر زندگی کے نامی گرامی رہنما اور سلف صالح کی روشن نئی صورت تھے، انہوں نے اپنے اہل وطن کے عقیدہ کو صفائی و پاکیزگی بخشی جبکہ اس پر کچھ زنگ لگ گیا تھا، اور انہوں نے دلوں میں فرض جہاد کی جوت جگائی جبکہ وہ مرنے کے قریب پہنچ گیا تھا، سوریا میں لاذقیہ کے قریب جبلۃ گاؤں میں وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، اسلامی تعلیمات و آداب کی رعایت سے نشو ونما پائی، اللہ کی کتاب قرآن مجید کو حفظ کیا، رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں رسوخ حاصل کیا، بڑے بزرگ علماء سے علوم عقیدہ، فقہ اور عربی زبان و ادب حاصل کر کے مزید علم کی تلاش میں مصر کا رخ کیا، وہاں جامع الازہر میں داخل ہو کر اس کے فاضل علماء کے مبارک ہاتھوں سے فراغت حاصل کی،

وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ پر قوی ایمان اور اس کے ساتھ اخلاص کے لئے معروف تھے، اور بڑے عالم فاضل اور عظیم المرتبت بزرگ شیخ تھے، ان کا زہد وتقویٰ اور دینداری و نیکی مشہور تھی، صدق واخلاص اور حب وطن میں ان کی سیرت دلپسند تھی، علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، سلفی عقیدہ کے حامل اور تقلید سے دور تھے، صوفیوں کے استغراق ومراقبوں کے خلاف تھے، عوام میں پھیلی بدعتوں سے جنگ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

جنگ عظیم اول کے بعد جب عثمانی خلافت ڈھا گئی، اور فرانس نے لبنان اور اس سے ملحق ساحلی پٹی (جس میں جبلۃ شہر بھی تھا) پر قبضہ کر لیا تو شیخ قسّام حملہ آور فرنچ لشکر کے خلاف کھڑے ہوئے، مال جمع کیا، لوگوں سے چندہ مانگنے سے پہلے خود اپنی جائداد بیچی، اور اس کی آمدنی مزاحمت کے لئے وقف کی، جوانوں اور بوڑھوں کے لئے اسلحہ خریدا، اور خود ان کی

قیادت کی، اس مزاحمت میں فرنچ فوج سے سخت معرکے ہوئے، ان کو بڑے نقصانات پہنچائے، پھر ۱۹۲۰ء کے اواخر میں سوریا سے فیصل کی شریفی حکومت زائل ہونے کے بعد فلسطین کا رخ کیا، حیفہ شہر پہنچے، اور وہاں استقرار ہوتے ہی جمعہ کے خطبے دینے لگے، سبق پڑھانا شروع کردیئے اور مسجدوں میں وعظ کہنے لگے، اس لئے عوام ان کی طرف مائل اور گرویدہ ہونے لگے، وہ اپنے دروس میں لوگوں کو علانیہ یاد دلاتے تھے کہ ان پر جہاد فرض ہے، اور قابض انگریزوں اور ان کے معاونین سے جنگ کے بغیر چارہ نہیں، اس لئے وہ لوگوں سے اسلحہ خریدنے اور ان کو استعمال کرنے کی مشق حاصل کرنے کا علی الاعلان مطالبہ کرتے تھے، فلسطین میں یہودیوں کے زمین خرید کر اپنے خواب پورے کرنے سے روکنے کے لئے وہ بہت فکر مند تھے، ایک مرتبہ انہوں نے منبر پر سے نمازیوں کو دشمن سے مقابلہ کرنے پر اکسایا تو ایک نمازی نے کھڑے ہوکر سوال کیا: ہم دشمن کا مقابلہ کیسے کریں جبکہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟ تو ان کے ساتھیوں میں سے عربی البدوی کی روایت ہے کہ تلوار ان کے ہاتھ میں تھی جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی اور وہ گرجتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''میں جوانوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ جھاڑوئیں لئے ہوئے سڑکیں جھاڑ رہے ہیں، وہ بندوقیں اٹھانے کے لئے میرے مدعو ہیں، اور میں جوانوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ برش ہاتھوں میں لئے ہوئے غیر ملکیوں کے جوتوں پر پالش کررہے ہیں وہ ریوالور اٹھا کر ان کو قتل کرنے لئے میرے مدعو ہیں''

شیخ قسّام جو اپنے علم، اخلاص، دلیری اور جہادی تجربہ کے لئے مشہور تھے ان سے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے منظّم عمل کی اہمیت چھپی ہوئی نہیں تھی جو کہ تعداد ساز وسامان، تجربہ اور منصوبہ بندی میں بڑھے ہوئے تھے، اسی طرح ان سے یہودی منصوبوں کی خطرناکی، دنیا میں ان کے طاقتور اثر و رسوخ اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف خباثت، مکر وفریب اور حقد وحسد مخفی نہیں تھا، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کی جذباتی عوامی موجیں عارضی ہیں جو فلسطین کے خلاف منظّم حاسدانہ حملہ کو نہیں روک سکیں گی، ان کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ فلسطینیوں کی سیاسی قیادت انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف معرکہ کی سطح ومعیار کی نہیں ہے، اس لئے انہوں نے ایک جہادی تحریک کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا، جو فلسطین کی آزادی کے لئے تنہا راستہ جہاد کو بنائے، پھر انہوں نے اس جہادی تنظیم کی تعمیر کا کام شروع کیا جو بعد میں سب سے خطرناک جہادی تنظیم اور سب سے بڑی فدائی تحریک نہ صرف فلسطین کی وطنی تحریک کی تاریخ بلکہ ماڈرن اسلامی جہاد کی تاریخ میں مانی گئی، اور اس کو اول حقیقی معاصر اسلامی تنظیم کی حیثیت حاصل ہوئی۔

شیخ قسّام تمام معرکوں میں خود شریک ہوتے تھے اور اپنے ساتھیوں میں جہاد وشہادت کا شوق پیدا کرتے تھے، اسی طرح کے ایک معرکہ میں ان کے ایمان سے بھرے ہوئے سینہ میں بندوق کی ایک گولی اتر گئی، اور وہ ۲۰ نومبر ۱۹۳۵ء کو خون میں لت پت شہید ہوگئے، شاید ان کی خوش بختی کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ اپنے رب سے راضی اور خوشی خوشی ملے، اور اپنے پیچھے ہزاروں مجاہدین چھوڑ گئے جو کئی سال تک اپنے اور اللہ کے دشمنوں سے لڑتے رہے، وہ نئے عہد میں فلسطین کی زمین پر اللہ کے دشمنوں سے حقیقی جہاد کی ابتدا کرنے والے تھے۔

(ہفت روزہ الامان بیروت شمارہ نمبر ۱۰۳۶، ۲۰ر نومبر ۲۰۱۲ء ص ۱۳)

☆☆☆

گوشۂ سیرت

''نقوش رفتگاں''
فکر و فن کے آئینہ میں

محمد قمر الزماں ندوی
استاذ مدرسہ نور الاسلام پرتاپ گڑھ (یوپی)

حکایتِ ہستی کے دو ہی اہم واقعات ہیں، پیدائش اور موت، موت وحیات کا یہ فلسفہ کائنات کے دیگر اسرار کی طرح اب تک صیغہ راز میں عقدۂ لاینحل ہے۔

فلسفی سرِّ حقیقت نہ تو انست کشود
گشت راز دیگرآں راز کہ افشانی کرد

اور کچھ لوگ متحیر انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

حالانکہ سچائی یہ ہے کہ انہیں دونوں کے تصور پر عمرانیات اور معاشرہ کی بنیاد کھڑی ہے، موت کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ زندوں اور مردوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتی ہے، اسی وجہ سے موت پر غم وافسوس، رنج وتکلیف ایک فطری جذبہ ہے، اور یہ جذبہ قدرت نے ہر انسان کو روز اول سے ودیعت کر دیا ہے، البتہ اہل ایمان کا اظہار غم اور طریقہ دیگر مذاہب واقوام سے مختلف ہے کیوں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو کائنات اور اس سے ماورا کے متعلق جو ہدایت دیتا ہے وہ خالص اسلامی اور فطری نظریہ اور تصور ہے، وہ یہ کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک دوسری حیات کی ابتداء ہے۔

موت پر اشکباری دنیا کی تاریخِ ادب میں ہمیشہ رہی ہے، مرنے والوں پر نثر ونظم دونوں کے ذریعہ اظہارِ غم کیا جاتا رہا ہے، دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں بطور خاص مرثیہ کا ایک خاص مقام رہا ہے، حضرت عیسیٰؑ کے متبعین اور پیر وکاروں کے یہاں جنازے کے سامنے جنازہ کی تقریر یا دعا ہوتی ہے، جو عموماً خطابت، زور بیان اور اظہار غم کا نمونہ ہوتی ہے، لینن کی موت پر ''تاریخ انقلابِ روس'' کا مصنف لیون ٹراسکی (Lavin Traski) نے ایسے تیرہ فقرے لکھے تھے جو روسی ادب کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔ (مستفاد مقدمہ یادِ رفتگاں از سید سلیمان ندویؒ)

بلاشبہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی کتاب ''نقوش رفتگاں'' کے وفیاتی مضامین بھی سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ''یادرفتگاں''، رشید احمد صدیقی کی ''گنج

ہائے گرانمایہ''، مفکر اسلام حضرت علی میاں ندویؒ کی ''پرانے چراغ'' اور مشہور شاعر و ادیب ماہر القادری کی کتاب ''یادِ رفتگاں'' کی طرح اردو ادب میں ایک نیا باب اور اچھوتا عنوان ہے۔ مولانا عثمانی نے ۶۱ باکمال افراد کی زندگیوں کا حسین گلدستہ اور مرقع اس حیات بخش مجموعہ میں پیش کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا عثمانی کے یہ وفیاتی مضامین فکر وفن اور زبان وادب کی چاشنی و دلکشی کے ساتھ معلومات کا ایک گنجینہ ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت نصف صدی کی داستانِ غم پر محیط ہے، یہ صرف ان مضامین کا مجموعہ اور گلدستہ نہیں جو مولانا عثمانی نے اس دنیا سے جانے والوں کے غم میں قلمبند فرمایا ہے، بلکہ مولانا نے ان شخصیات کے اوصاف وکمالات کے مرقع کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے ساتھ گزرے ہوئے ایام اور واقعات و تأثر کو علمی اور ادبی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس مجموعہ میں استاذ کا ماتم ہے، والدین اور بھائی کا نوحہ ہے، فضل وکمال کا مرثیہ ہے، اخلاق وشرافت کا رونا ہے، دینداروں کا غم ہے، فاضلوں، ادیبوں، بزرگوں، اللہ والوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، مصنف کے رقیق قلب، محبوب دل اور مفکر دماغ کے گہرے نقوش ہیں، ایسے نقوش جو دل سے نکلتے ہیں اور دل میں پیوست ہوجاتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس مجموعہ ادب و انشاء کے بھی انمول اور اچھوتے جواہر پارے اور تذکرہ نگاری، سوانحی نقوش کے قیمتی شہ پارے اور مصنف کے متوازن اور وسیع قلب ودماغ کے نگارخانے ہیں۔

اس مجموعہ میں مولانا عثمانی نے اپنے، پرائے، عالم اور غیر عالم، پیر اور فقیر، ادیب اور شاعر، سیاست دان اور گوشہ نشیں، استاذ اور مربی سب سے خصوصی تعلقات برادرانہ خلوص، بزرگانہ شفقت، عزیزانہ محبت کا اظہار کیا ہے، اور ان سبھوں کی اشک سوئی میں اپنی آنکھیں اشکبار کی ہیں۔ مولانا نے بطورِ خاص مصلحین، اساتذہ، مشائخ وقت، دانشورانِ وقت اور بعض سربراہانِ مملکت کا ایسا دل آویز تذکرہ کیا ہے جو سوانحی نقوش، تذکرہ نویسی اور خاکہ نگاری کے ساتھ ادب اسلامی کا مستقل باب بن گیا ہے، علم وفضل کی تاریخ، شخصیت کا صحیح، مناسب اور متوازن تعارف، کسی کی زندگی پر حقیقت پسندانہ و عالمانہ تبصرہ، کسی کے علمی نوادرات کا ذکر اور سیاسی افراد اور بعض سربراہانِ مملکت کے سیاسی افکار وخیالات اور کسی اسلامی ذہن رکھنے والے سیاسی رہنما کی دور بینی کا ذکر خیر آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کسی کی زندگی کا تاریخی حیثیت سے جائزہ سپرد قرطاس کرنا اہم اور نازک ذمہ داری ہے کیوں کہ ذرا سی فکری لغزش اور قلم کی معمولی جنبش سے مورخ اور سوانح نگار افراط وتفریط اور غلو پسندی کا شکار ہوسکتا ہے، لیکن مولانا عثمانی نے اس کتاب میں کمالِ احتیاط کے ساتھ فکر متوازن، وسیع المشربی، کشادہ قلبی، مثبت اور تعمیری وتنقیدی جوہر کا ثبوت دیا ہے۔

تذکرہ نگاری اور خاکہ نگاری میں ادب و انشاء کی حلاوت و چاشنی، الفاظ کی شیرینی اور جودت و ندرت کی تلاش وجستجو جب ہی ممکن ہے، جب مؤرخ اور سوانح نگار زبان کا اداشناس اپنے زمانہ اور اہلِ زمانہ کا مزاج آشنا، کہنہ

مشق اور صاحبِ طرز ادیب ہو۔ سچائی یہ ہے کہ اسلوبِ نگارش اور ایجاز نویسی کے اعتبار سے اگر بہترین کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب بھی ضرور شامل کی جائے گی، اس میں فصاحت و بلاغت اور انشاء پردازی کی ایسی گل کاری ہے کہ اس کو پڑھتے وقت کہیں انشاء پردازی کی قوسِ قزح نظر آتی ہے، کہیں حقیقت نگاری کی بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی ہے، کہیں عقیدت کے پھول کھلتے ہیں، کہیں اعترافِ حقیقت کی چاندنی جھلکتی ہے تو کہیں تفسیر و بیان کی کوثر و تسنیم بہتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ پوری کتاب گلہائے رنگارنگ کا ایک بے مثال چمنستان بن جاتی ہے، ایک ایک حرف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ غم میں سرشار ہیں اور ایک خاص کیفیت کے ساتھ مرحوم کے آستانہ میں عقیدت کے پھول چڑھا رہے ہیں۔

آیئے ہم ''نقوش رفتگاں'' کے بعض نقوش پڑھیں اور صاحب کتاب کے قلم کو دادِ تحسین دیں۔

مرحوم جنرل ضیاء الحق شہید کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف تھیں، ان کے بارے میں لوگوں کی رائے میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں، شروع میں کچھ لوگ انہیں فرشتۂ معصوم اور فرشتۂ غیبی کہتے نہ تھکتے تھے لیکن بعد میں ان ہی لوگوں کی زبان سے ان کے بارے میں دلخراش الفاظ سنے گئے، یہاں تک کہ انہیں اسلام دشمن اور منافق و فاسد کہنے سے لوگوں نے دریغ نہیں کیا۔ مولانا عثمانی نے ان کی شہادت کے بعد ان کی شخصیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ انتہائی مبنی پر حقیقت اور جامع تبصرہ اور تجزیہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے نہ انہیں پہلے دن فرشتۂ معصوم یا خلیفۂ راشد سمجھا تھا نہ آخر میں'' (خدانا خواستہ) اسلام دشمن یا منافق قرار دینے کا کوئی واہمہ بھی دل میں نہ پیدا ہوا، ہاں انتخابات پر یقین اور سو فیصد یقین تھا کہ ماضی میں ہم نے جتنے حکمرانوں کے تجزیے کیے ہیں، اور بظاہر حالاتِ آئندہ کے لئے جو لوگ سامنے ہیں ان کے مقابلے میں وہ اپنی اسلامی روح، دینی جذبے، خود اپنی ذاتی زندگی کے حالات کے لحاظ سے اتنے قابلِ قدر انسان ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کی شخصیت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر ان کے ساتھ نفاذِ اسلام کے مشن میں بھرپور تعاون کرنا چاہیے، پاکستان ہی میں نہیں جکارتا سے رباط تک عالم اسلام کے دوسرے ملکوں میں بھی مجھے کوئی حکمراں ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اسلام پر ایسا غیر متزلزل ایمان اللہ کے ساتھ تعلق اور اسلام کی سربلندی کا ایسا ولولہ رکھتا ہو''۔ (نقوش رفتگاں صفحہ ۲۶۳)

مزید لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ گیارہ سال کے دوران نفاذِ اسلام و شریعت کے سلسلے میں جتنا کام اللہ نے شہید مرحوم کے ہاتھوں کرایا، وہ اس سے پہلے تیس سال میں نہیں ہوا تھا اور نفاذِ شریعت کے سلسلے میں ان گیارہ سال کو ایک پلے میں اور پہلے کے تیس سالوں کو دوسرے پلے میں رکھا جائے تو یقیناً ان گیارہ سال کا پلہ بھاری رہیگا'' (نقوش رفتگاں صفحہ ۲۶۵)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے آپ اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ عثمانی صاحب کا اندازِ تحریر، ادب و انشاء کا کیسا اعلیٰ نمونہ اور معیار ہے اور ان کا اسلوب کتنا سلیس رواں

اورشگفتہ ہے۔

''نقوش رفتگاں'' کی بعض دوسری تحریروں کو بھی پڑھئے کہ مولانا عثمانی نے اپنے والدین کا تذکرہ کس خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے، نیز ان جملوں کی حقیقت واد بیت کا لطف بھی لیجئے، یقیناً آپ گواہی دیں گے کہ ادب اسلامی کا یہ اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا نے اپنی والدہ محترمہ کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا اس مضمون کا ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ کریں۔ لکھتے ہیں:

''اس روئے زمین پر ماں کس کو عزیز نہیں ہوتی؟ اور کون ہے جسے اس نعمت کے زوال پر صدمہ نہ ہو؟ لیکن میری والدہ ماجدہ.....اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں میں ڈھانپ کر ابدی راحتیں نصیب فرمائے۔ اس قرن کی ماؤں میں سے تھیں جن کی آغوش بچوں کے لئے صرف ایک گہوارہ نہیں، بلکہ تعلیم و تربیت کا موثر ترین مرکز بھی ہوتا تھا۔ جہاں کتابوں کے بجائے عمل کے ذریعہ آدابِ زندگی سکھائے جاتے تھے، وہ کسی کالج، یونیورسٹی یا کسی مدرسے کی تعلیم یافتہ نہیں تھیں بلکہ ان کی تعلیم گھریلو طور پر قرآن مجید اور اردو دینیات کی حد تک محدود تھی، لیکن سیرت و کردار کی جو عظمتیں تعلیم و تربیت کا جو انداز اور ملک وملت کے مسائل سے جو تعلق ان کو حاصل تھا، آج کل اونچی اونچی ڈگریاں رکھنے والی خواتین میں بھی نایاب ہے۔ صبر و قناعت، محنت اور جفاکشی، ایثار و خوداری اور ہمت اور بلند حوصلگی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ (نقوش رفتگاں صفحہ ۱۶۰)

مزید لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں ماں باپ کی محبت وشفقت کا کوئی بدل نہیں ہے۔ یہاں پر ہر ایک محبت میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور شامل ہوتی ہے، لیکن اولاد کے لئے صرف ماں باپ کی محبت ایسی ہے جو بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کے دکھ درد پر اس خلوص کے ساتھ نہیں تڑپ سکتا جس خلوص کے ساتھ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے تڑپتے ہیں۔ اس سائے سے محرومی کوئی معمولی محرومی نہیں، اور آج جب یہ تصور کرتا ہوں کہ اب ہمیں ''بیٹا'' کہنے والا باقی نہیں رہا تو نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔'' (نقوش رفتگاں صفحہ ۱۶۳)

اپنے والد ماجد کی وفات پر عثمانی صاحب نے جو کچھ لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

''بات صرف ایک باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی نہیں ہے، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو یہ صدمہ ایسا گمبھیر نہ ہوتا، دنیا میں کسی باپ کا سایہ ہمیشہ باقی نہیں رہتا اور بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں یتیمی سے سابقہ نہ پڑتا ہو، لیکن یہاں معاملہ ایسا ہے کہ ان کے سفرِ آخرت سے نہ جانے کتنے سائے اس غمزدہ سر سے اٹھ گئے ہیں، باپ کا سایہ، استاذ کا سایہ، شیخ و مربی کا سایہ، ہادی و رہنما کا سایہ اور ایک ایسے غم خوار و غم گسار کا سایہ جس کے اٹھنے کے بعد زندگی میں پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ غم اور صدمہ کسے کہتے ہیں؟ ورنہ سخت سے سخت صدمہ اور بڑی سے بڑی فکر ان کے قدموں میں پہونچ کر بے نشان ہوجاتی تھی، اور ان کے پائنتی بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کائنات میں ہمارے لئے محبت و شفقت کے سوا کچھ نہیں۔ اب بھی جب صدمہ ناقابل برداشت

ہونے لگتا ہے تو پاؤں بے ساختہ ان کے کمرے کی طرف اٹھ جاتے ہیں، وہاں ان کی چارپائی اسی طرح بچھی ہے جس پر لیٹ کر، بیٹھ کر انہوں نے اپنی عمر کے آخر چار سالوں میں گونا گوں امراض وآزار کے عین درمیان نہ جانے کتنے بے شمار دلوں کے لئے شفا کا سامان کیا، تشنگانِ علم ومعرفت کی پیاس بجھائی، کتنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو دلاسے دئے، ان کے لبوں سے نکلی ہوئی ان گنت دعاؤں اور بے شمار اذکار وتسبیحات کی مہک آج بھی اس کمرے میں بسی ہوئی ہے۔ اسی چارپائی کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر ان کے سجدوں کے انوار آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ دیوار پر وہ گھنٹہ اب بھی نصب ہے جس پر ہر دس پندرہ منٹ بعد ان کی نگاہیں پڑتیں، اور وقت کی قدر پہچاننے کا عملی سبق دیتی تھیں۔ چارپائی کے سامنے وہ کرسیاں اسی طرح رکھی ہیں جس پر وزیر وامیر سے لیکر چپراسی اور مزدور تک یکساں حیثیت میں بیٹھتے اور اس مردِ درویش کے جاہ و جلال سے یکساں طور پر مرعوب ہوکر رہتے تھے، جس کے کپڑوں میں بعض اوقات ایک سے زائد پیوند ہوا کرتے تھے'' (نقوش فتگاں صفحہ ۶۷)

مولانا عثمانی کی اس تحریر پر نظر ڈالیئے اور دیکھیئے کہ کیسے مترادفات اور اضداد کا کس خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ شیخ ومربی، ہادی ورہنما، غم خوار وغمگسار، محبت وشفقت، علم و معرفت، اذکار وتسبیحات، جاہ وجلال جیسے الفاظ پر غور کیجئے کہ اپنے اندر ادبیت کی کتنی دلکشی اور چاشنی لئے ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوں، اب میرے سامنے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ پر لکھا ہوا مضمون ہے، مضمون پڑھتے پڑھتے راقم السطور پر ایک کیفیت طاری ہوگئی کیوں کہ ماضی قریب کے جن علماء و اکابرین کی شخصیت کے اخلاق اور اوصاف وکمالات پڑھ کر اور سن کر احقر متاثر ہوا ان میں حضرت قاری صاحب کی شخصیت سرِ فہرست ہے۔

قاری طیب صاحبؒ کے فردوس بکف تذکرہ پر مولانا عثمانی کا حسنِ رقم گویا سونے پر سہاگہ کے مرادف ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں مولانا عثمانی کے خامۂ معجز نما کی افسوں طرازیاں گوشِ گزار کیجئے:

''جہاں تک وعظ وخطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحبؒ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پرتکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن اندازِ بیان اتنا سہل کہ سنگلاخ مباحث بھی پانی ہوکر رہ جاتے۔ جوش وخروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی، اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی، ایسا معلوم ہوا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی

تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا، جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔ حضرت قاری صاحبؒ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی، اور کتنے غلط عقائد ونظریات سے تائب ہوئے'' (نقوش رفتگاں صفحہ ۱۹۲)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''دارالعلوم دیوبند کا منصب اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت قاری صاحبؒ نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا، اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف کردی، سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پرسکون ہی دیکھا۔ اجلاسِ صد سالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لیے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا، دیوبند جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا، کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کرسکتا، لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت قاری صاحبؒ کے پاس حاضری ہوئی تو حسب معمول انہیں متبسم اور پرسکون دیکھا، چہرے پر تھکن ضرور تھی، لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی۔ افسوس ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں باہمی اختلافات نے جن طوفانی ہنگاموں کی شکل اختیار کی، انہوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کردیا، دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات و واقعات سے واقفیت تو نہ تھی، لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس عمر میں حضرت قاری صاحبؒ پر ان ہنگاموں کی کے وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی؟ اس زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق و ناحق کا فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہوسکے گا، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس عمر میں ان کو دیا ہے، وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔'' (نقوشِ رفتگاں صفحہ ۱۹۳/۱۹۴)

یقیناً ہمیں اس بات کا حق ہے کہ ہم مولانا عثمانی مدظلہ کی اس تصنیف کو ادب اسلامی کا فن پارہ وشاہکار قرار دیں اور اس کے علمی وادبی جواہر پاروں سے اپنے عقل وذہن کو روحانی غذا پہنچائیں، بس ان ہی جملوں پر اپنے قلم کی زبان کو خاموش کرتا ہوں۔ اس سچائی اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ مولانا عثمانی کے یہ نقوش صرف علماء دیوبند اور وہاں سے وابستہ اکابرین واشخاص کے حلقہ تک محدود ہیں۔ دیگر طبقات اور حلقوں کے علماء و ادباء (مثلاً جماعت اسلامی اور اہلِ حدیث) کا تذکرہ نہیں ہے، اگر عثمانی صاحب وسعت سے کام لیتے اور صرف ایک ہی حلقہ تک اپنی نگارشات کو محدود نہ کرتے تو بات ہی کچھ اور ہوتی۔

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

موجودہ تہذیب میں اسلامی معاشرہ کی اہمیت

ابوسعد اعظمی
anislahi@gmail.com

موجودہ تہذیب سراسر مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہے، جہاں عیش وعشرت کی فراوانی اور ہر جائز وناجائز طریقے سے مال ودولت کی حصولیابی کو ہی اصل کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس رجحان کو عام کرنے میں ذرائع ابلاغ اور میڈیا کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ اوراس کا نتیجہ بھی سب کے سامنے ہے، مالدار اور بڑا آدمی بننے کی خواہش نے ملک میں فساد اور بدعنوانی کی عام فضا قائم کردی ہے، اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہورہی ہیں، دین وایمان سے انسان کا رشتہ دن بدن کمزور ہوتا جارہا ہے، ایمان وعقیدہ کی راہ میں معمولی سے معمولی قربانی دینے کا جذبہ بھی سرد پڑتا جارہا ہے، ایسے میں مسلم نوجوان کی غفلت اور فرض ناشناسی، اپنے اسلاف کی زریں تاریخ اور محیر العقول کارناموں سے ناآشنائی انتہائی تشویشناک اور افسوس کن ہے، اسلامی معاشرہ کے روشن اور تابناک پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں، انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ اسلامی معاشرہ میں اصل تفوق وبرتری کا پیمانہ مال ودولت نہیں بلکہ خشیت الٰہی اور خداترسی کی روش ہے، اس لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ صحابہ کرام کے ایمان افروز واقعات اوراسلامی معاشرہ کے تابندہ نقوش اس طرح ان کے سامنے پیش کئے جائیں کہ ان میں شوق عمل پیدا ہو اوراس مثال کو پیش نظر رکھ کر وہ اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے دل وجاں سے کوشاں ہوں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ پاکیزہ سماج اور صالح معاشرہ جو آج سے ہزاروں سال قبل عرب کی سرزمین میں خود رسول خدا ﷺ نے قائم کیا تھا آج دنیا میں کہیں بھی اپنی اصل اور مکمل شکل میں موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اخوت ومحبت، مودت ورحمت، ہمدردی وغمگساری، ایثار وقربانی، فدائیت وجانثاری اور حسن اخلاق وحسن عمل کے جن سچے، قابل عمل اور دائمی اصولوں پر یہ اسلامی معاشرہ تعمیر ہوا تھا وہ اصول آج بھی کتاب وسنت میں محفوظ ہیں۔ اوراگر انہیں اپنی زندگیوں میں نافذ کرلیا جائے تو اب بھی ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا قیام ممکن ہے جو فساد اور بدعنوانی کے تعفن سے پاک، اخلاقی قدروں پر مشتمل ایک انسانی معاشرہ ہوگا۔ جہاں انسانیت کی تکریم ہوگی، مال ودولت کو عطیہ خداوندی کی حیثیت حاصل ہوگی اور اسے پاکر قارونیت کے بجائے صدیقیت کا کردار پیش کیا جائے گا۔ خود سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دے کر "یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة" کا کردار سامنے آئے گا۔ جہاں مساوات کو بالادستی حاصل ہوگی اوراسی کی بنیاد پر عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔ اور خلیفہ وقت کا بیٹا بھی اگر کسی جرم میں ملوث پایا جائے تو بلاکسی امتیاز وتفریق کے اس پر بھی سزا

کا نفاذ کیا جائے گا۔افراد کی عظمت مال ودولت کی بنیاد پر نہیں بلکہ تقوی اور خشیت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہوگی۔اس معاشرہ میں حاکم وقت کا بھی طرز معاشرت اتنا سادہ اور غریبانہ ہوگا کہ سفر وحضر اور جلوت وخلوت میں کوئی شخص کسی علامت سے یہ نہیں پہچان سکے گا کہ یہ خلیفہ وقت ہیں۔اور ایک بڑھیا کو بھی اس بات کا یارا ہوگا کہ وہ برسر مجمع خلیفہ وقت کی بات کاٹ کر ان سے عدل وانصاف کی وضاحت طلب کرلے۔اس پاکیزہ معاشرہ میں بزرگوں کا ادب،اہل علم کی قدر ومنزلت محتاجوں اور بیکسوں کی دادرسی،چھوٹوں پر شفقت،ہم عمروں کے ساتھ محبت والفت اور جذبہ حق وایثار کا عملی نمونہ نظر آئے گا اور چشم فلک اپنی آنکھوں سے وہ منظر بھی دیکھے گی جب ایک جاں بلب شخص،جو زخموں سے چور ہے اور اسے پیاس کی شدت بھی ہے اس وجہ سے پانی پینے سے انکار کردے گا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی پیاس کی شدت سے بلبلا رہا ہے اور بالآخر اسی پیاس کی حالت میں ہی اس امید پر جاں جان آفریں کے سپرد کردے گا کہ حوض کوثر پر ساقی کوثر کے ہاتھوں اسے جام شراب نصیب ہوگا۔اس اسلامی معاشرہ میں خوف خدا اور آخرت میں جوابدہی کا احساس اس قدر شدید ہوگا کہ شدید ظلمت اور رات کی تنہائی میں جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہیں ہوگی،اس وقت بھی جب اس کی ایک آشنا دوشیزہ پرتپاک انداز میں اسے اپنے ساتھ شب باشی کی دعوت دے گی تو اسلامی کردار یہ کہہ کر معذرت کرلے گا کہ زنا اب حرام ہوگیا ہے۔اس پاکیزہ معاشرے میں ہیرے جواہرات سے مرصع تاج جب اسلامی کردار کے ہاتھ لگے گا تو وہ اسے لے کر سیدھا امیر وقت کی خدمت میں حاضر ہوگا اور جب اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کہے گا کہ میں نے جس کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے وہ میرے نام سے بھی واقف ہے۔یہاں دنیائے انسانیت وہ عجیب وغریب منظر بھی دیکھے گی جب غلام اونٹ پر سوار ہوگا اور خلیفہ وقت اونٹ کی نکیل تھامے پیدل چل رہا ہوگا۔عقیدہ توحید سے سرشار ان جانبازوں کا سر اتنا اونچا اور دل ونظر خدائے تعالی کی عظمت سے اتنا معمور ہوگا کہ مخلوقات کا حسن وجمال،دنیا کی دلفریبیاں،شان وشوکت کے مظاہرے ان کی نگاہ میں ہیچ ثابت ہوں گے۔یہاں اسلامی کردار اس آیت کا مصداق نظر آئے گا کہ " انما نطعمکم لوجه الله لا نرید منکم جزاء ولا شکورا" ان کے قول وعمل اس بات کی شہادت دیں گے کہ " یبتغون فضلا من الله ورضوانا سیماهم فی وجوههم من اثر السجود"۔ان کا طرز معاشرت اس بات کی دلیل ہوگا کہ "وفی أموالهم حق للسائل والمحروم" اور وہ اس قرآنی ہدایت پر کہ " فاما الیتیم فلا تقهر واما السائل فلا تنهر " مکمل طور پر کاربند نظر آئیں گے۔کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ اور کوئی ضرورتمند ان کے پاس سے ناکام ونامراد نہیں لوٹے گا۔ان کے پڑوسی بھی ان کے سائے تلے امن وعافیت کا احساس کریں گے اور انہیں ان سے کسی طرح کی اذیت اور روحانی کرب کا شکوہ نہیں ہوگا۔اس اسلامی معاشرہ میں انسانی کردار کی ایسی عظمتیں اور اخلاقی قدروں کی ایسی رفعتیں دنیائے انسانیت کے سامنے آئیں گی کہ وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے اور یہ درحقیقت اسلامی ثقافت وتہذیب کے ایسے تابندہ نقوش ہوں گے جنہیں اپنا کر ظلم وتشدد کی چکی میں پس رہی انسانیت حقیقی طور پر امن وعافیت کا گہوارہ بن سکے گی اور دنیا ہی میں جنت ارضی کا سماں پیش کرے گی۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: آخری وحی، اردو ترجمانی کے جدید قالب میں (جلد اول)
مؤلف: مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
ناشر: مکتبۃ الشباب العلمیۃ لکھنؤ
صفحات: ۴۳۳

قارئین نے کتاب کے نام اور اس کے مؤلف کا نام پڑھ کر ہی شاید یہ تاثر قائم کرلیا ہوگا کہ اس میں کچھ نہ کچھ جدت ضرور ہے، جی ہاں! یہ قرآن کریم کی اردو ترجمانی ہے جو عصری اسلوب کا لبادہ اوڑھ کر عام لوگوں کی قرآن فہمی کے لئے بہت مفید ومؤثر ہے، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی نے ترجمانی کا یہ کام کہنے کو تو محض گزشتہ رمضان میں انجام دیا لیکن درحقیقت یہ ان کی عمر عزیز کے اکثر حصہ کی جدو جہد، غور وفکر اور مطالعہ وتدریس کا ایسا پر کشش، عمدہ اور انوکھا ثمرہ ہے جو ان ہی کا حصہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادیب وتخلیق کار کی شخصیت کا پرتو تحریر پر نہیں پڑنا چاہیے، لیکن اس کے برعکس وہ موقف زیادہ مضبوط ہے جو اس کی ضد ہے، کیوں کہ مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر تحریریں شخصیت کا عکس لیے بغیر منظر عام پر نہیں آتیں، مولانا محترم کی یہ تالیف بھی ان کی شخصی خصوصیات کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے، مولانا کی طبیعت میں جستجو، تڑپ، تجدد پسندی، اختراع اور عجلت کے ساتھ اسلام کو ایک مکمل نظام کی شکل میں نافذ ہوتا دیکھنے کی تمنا ہے، جس نے ان سے سینکڑوں کام انجام دلائے، متعدد اسباب کے ساتھ ممکن ہے کہ ان کاموں کا عدم استقامت واستقلال کے سبب وجود نہ باقی رہا ہو لیکن کلام اللہ کی یہ خدمت ان ہی خصوصیات کے زیر اثر انجام پائی جو انشاء اللہ ہمیشہ سلامت اور باعث سلامتی رہے گی، دنیا جانتی ہے کہ وہ سحر آگیں، اثر انگیز دلائل و براہین سے معمور، مؤثر اور زور آور اسلوب خطابت کے مالک ہیں، اور اکثر خطابت کے شہسوار میدان لوح وقلم میں بے بس ومجبور نظر آتے ہیں لیکن اقلیم سلمانی میں قلم کی بھی وہی گھن گرج ہے جو خطابت میں سنائی دیتی ہے، یہ الگ بات کہ خطابت کی مقبولیت کے باعث قلم کو یہاں وہ حصہ نہیں دیا گیا جس کی امید تھی، جبکہ قلم کو جو قطعیت و ابدیت اور وزن حاصل ہے خطابت سے اس کی امید نہیں کی جاسکتی، مولانا محترم کو اللہ نے بے پناہ صلاحیتوں اور خصوصیات سے نوازا ہے، ان کو حق تھا کہ وہ قرآن کی تشریح کریں، اس لیے کہ ان کو اردو وعربی زبان میں نہ صرف ید طولیٰ حاصل ہے بلکہ وہ ان کی نزاکتوں سے بھی واقف ہیں، بلکہ فارسی میں بھی ان کو اردو اور عربی ہی کی طرح ملکہ حاصل ہے، حدیث وتاریخ پر ان کی گہری نظر ہے، بلکہ حدیث ان کا اختصاص ہے جبکہ تفسیر ان کا ہمیشہ سے محبوب ترین موضوع رہا ہے، استحضار ایسا کہ دوران خطاب جو آیات پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ گویا اسی موقع کے لئے وہ نازل ہوئی ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں گویا پورے قرآن کا منظّم ومرتب ترجمہ حفظ ہو، جملہ خصوصیات کے ساتھ استحضار اور قوت استدلال کے زبردست ملکہ نے ان سے ''محبت'' کرنے والوں میں بھی

اضافہ کیا ہے،

قرآن کریم کی ترجمانی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ مولانا کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صرف نیا ہی نہیں بلکہ اب تک تاریخ تراجم قرآن میں ایک منفرد اسلوب اختیار کیا ہے، تاریخ تفسیر میں چند ایک مفسرین نے نظم قرآن کی فکر پر محنت کی ہے بعض متقدمین کے علاوہ اس ضمن میں علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نمایاں ہے، لیکن مولانا سید سلمان الحسینی صاحب نے جو اسلوب اختیار کیا اس سے نہ صرف قرآن کے مطالبات اور مطلوبہ مضامین بہ آسانی سمجھ میں آتے ہیں بلکہ پورا قرآن منظّم ومرتبط اور ایک انقلابی امت کی تشکیل کا داعی نظر آتا ہے، اور اس کی تمام سورتیں اور آیات تذکیر وہدایت کے جلی عنوان کے تحت مختلف ذیلی عناوین میں منقسم اور معنوی طور پر باہم مرتبط نظر آتی ہیں،

قرآن کا ترجمہ لفظی ہوسکتا ہے، بامحاورہ ہوسکتا ہے یا پھر اس کی ترجمانی ہوسکتی ہے، ترجمانی قرآن میں لغوی معنی بیان نہ کر کے ایک آیت کے مفہوم ومقصود کو بیان کیا جاتا ہے، یہ اسلوب اس لیے بھی بہتر ہے کہ درحقیقت عربی الفاظ پھر کلام اللہ کی تراکیب کی بلاغت ولطافت اور فصاحت و نزاکت بسا اوقات ایسی ہوتی ہے کہ اسے دنیا کی کسی زبان میں منتقل کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا، جس کی ادنی مثال یہ ہے کہ اگر قرآن کا لفظی ترجمہ ہی کیا جائے تو بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جملہ سے کرنا پڑتا ہے اسی لیے ماضی میں بعض علماء ترجمۂ قرآن کے قائل صرف اس لیے نہ تھے کہ ترجمہ میں قرآن کے اسلوب کی قوت وتاثیر کو منتقل کرنا ناممکن ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ خواہ قرآن کے لسانی اعجاز کا مظہر نہ ہو پھر بھی قرآن کے مقصد تذکیر وہدایت کو پورا کرتا ہے، اسی لیے ہر دور میں قرآن پاک کی مختلف اسلوب میں ترجمانی و تفسیر ہوتی رہی ہے، ترجمہ کی یہ تیسری قسم بہ آسانی قاری کو قرآن کے معانی ومقاصد اور مطالبات تک پہنچاتی ہے، وہ تفسیری نوٹ اور حواشی کی الجھنوں سے بچ بچا کر روح قرآن تک پہنچتا ہے جو قرآن کے نزول کا اصل مقصد ہے اور ایک عام ذہن اس سے زیادہ کا متحمل بھی نہیں۔

مصنف نے یہی تیسرا اسلوب اختیار کیا ہے اور اس کو مزید مؤثر بنانے کے لئے مروجہ الفاظ وتراکیب کا بھر پور استعمال کیا ہے، ترجمانی کی مزید توضیح کے لئے بین القوسین میں ہی لفظ دو لفظ اور فقرے دو فقرے سے کام لیا ہے، بعض اہل علم کے مطابق یہ اسلوب اور مصنف کی یہ کاوش عوام کے لئے زیادہ عام فہم ہے، لیکن ہم تعلیم وتعلم سے شغف رکھنے والوں کا حال جانتے ہیں اس لیے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ عوام کے ساتھ یہ کتاب اہل علم کے لیے غور وفکر کے نئے پہلو وا کرتی ہے اور اگر کچھ نہیں تو قرآن کریم سے ان کے شغف ومحبت میں اضافہ تو ضرور کرتی ہے، مزید ان کے سامنے اسرار ورموز کے ابواب بھی وا کرتی ہے۔

کتاب کی سب سے نمایاں، سب سے الگ، سب سے جداگانہ جو خصوصیت ہے، جس سے مصنف کی عرق ریزی، وسعت مطالعہ، قرآنی استحضار، قرآن کے موضوعات ومعانی پر دقیق نظر اور ان کی شخصی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے وہ ان کی تیار کردہ قرآن کی موضوعاتی فہرست ہے، جس سے ایک جانب تمام آیات قرآنیہ مرتبط ومنظّم نظر آتی ہیں اور ایک لمحہ میں پورے قرآن کے موضوعات ومطالبات پر نظر پڑ جاتی ہے تو

دوسری طرف قرآن کے انقلابی اعجاز وانقلابی فکر اور مکمل نقلابی نظام کی تصویر نظر آتی ہے، جس سے ایک کیفیت ایک احساس اور ایک تمنا کا پیدا ہونا کوئی بعید بات نہیں، فاضل مصنف گرامی نے پورے قرآن مقدس کو موضوعات کے اعتبار سے ابواب میں تقسیم کیا ہے، پھر ہر باب میں سورتوں کو متعدد فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور ذیلی عناوین قائم کیے ہیں، یقیناً یہ ایک نئی، مؤثر اور ملخص کوشش ہے جو اسی کا حصہ ہے غور وتدبر قرآن جس کا اوڑھنا بچھونا ہو ذرا نمونہ کے لئے ایک نظر موضوعاتی فہرست کے بعض حصہ پر ڈالیں:

ابواب و فصول

مقدمۂ قرآنِ عظیم (سورۂ فاتحہ) کے موضوعات

۱۔ ہر اہم کام میں ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا دھیان اور ان پر ایمان وایقان

۲۔ صفاتِ جمالی، صفاتِ کمالی، صفاتِ جلالی کا بیان

۳۔ اسمائے الٰہی اور صفاتِ ربانی میں رحمت کا غلبہ

۴۔ ربِ کائنات کا تمام مخلوقات سے الوہیت و ربوبیت کا تعلق

۵۔ بندوں کا اپنے مالکِ حقیقی سے تعلقِ عبادت واستعانت

۶۔ ہدایت اور صحیح راستہ کی رہنمائی، انس وجن کی سب سے بڑی ضرورت

۷۔ معیارِ ہدایت کون کون ہیں؟ اللہ کے پسندیدہ اور انعام یافتہ کون ہیں؟

۸۔ کون لوگ اللہ کی لعنت وغضب کے مستحق ہیں؟

۹۔ گمراہ لوگوں کی پہچان کیا ہے؟

۱۰۔ اللہ کے غضب کے اسباب اور ہر طرح کی گمراہی کی وجوہات اور ان کے نتائج

پہلا باب

یہودیوں اور عیسائیوں کی تحریفات اور انحرافات اور امت مسلمہ کی تشکیل

فصل اول: (سورۃ البقرۃ)

یہودیوں کے عروج وزوال کے اسباب، ان کی معزولی، امتِ مسلمہ کی عالمی رول کے لئے تیاری اور جامع نظام کا خاکہ

فصل دوم: (سورۃ آل عمران)

عیسائیت کے مغالطے، اور معرکۂ حق وباطل کے ذریعے امتِ مسلمہ کی ایمانی، دعوتی اور جہادی تربیت

فصلِ سوم: (سورۃ النساء)

خواتین کے حقوق وواجبات، اسلامی معاشرتی نظام، اور امتِ اسلامیہ کے تشخص کے تقاضے

فصلِ چہارم: (سورۃ المائدۃ)

عیسائیوں کی غلو پسندی، یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں واضح موقف اور مسلم معاشرہ کے تحفظ کے انتظامات

==========

مولانائے محترم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی ترجمانی منظم ومرتب ومرتبط اور آفاقی وانقلابی فکر کی مضبوط بنیاد اور مفصل دستور کے طور پر پیش کردی ہے اور یہ اس لیے کہ وہ اس کو نہ صرف زندہ، آفاقی اور انسانی کتاب سمجھتے ہیں بلکہ اس کے مکمل نفاذ کے خواہاں وکوشاں نظر آتے ہیں بلکہ اس راہ میں وہ کشتیاں جلانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں اور بسا اوقات مصلحت پسندی کو بزدلی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا کی پیش کردہ ترجمانی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، ادبی چاشنی سے لبریز ان کا مسلسل و مرتبط اندازِ ترجمانی مجبور کرتا ہے کہ قاری از اول تا آخر اس کا مطالعہ کرے، ان کا یہ اسلوب قلب و دماغ کو جھنجھوڑنے، روح قرآن سے قریب کرنے، زندگیوں کو بدلنے اور خالص اسلامی معاشرے کی تشکیل میں بے حد ممد و معاون ہے اس لیے تمام ممکنہ وسائل کا استعمال کر کے اسے گھر گھر پہنچانا راقم ضروری سمجھتا ہے۔

قرآنِ کریم کی اس ترجمانی میں تمام تر اثر آفرینی، ادبیت و جاذبیت کے ساتھ اس کا احساس ہوتا ہے کہ عوام کے لئے اصطلاحات یا بعض خالص عربی الفاظ وتراکیب کا مفہوم بین القوسین یا حواشی میں درج کیا جاتا تا کہ حصول مقصد مزید آسان ہوتا، فاضل مصنف گرامی سے اس کی قوی امید ہے کہ وہ اس آفاقی اور آخری کتاب کے آفاقی اور حتمی مکمل نظام کو اس کے اعجازی پہلو کے ساتھ ایک مکمل و ملخص اور پر مغز تفسیر کی شکل میں آئندہ پیش کریں گے، مصنف گرامی کے لئے یہ مشکل بھی نہیں بلکہ ان کا حق ہے، اور مزید جرأت و وضاحت کے ساتھ کہا جائے تو یہ ان پر قرض ہے، اگر یہ کام ہو جائے تو اس دور کی ایک گراں قدر خدمت کے ساتھ شاید مضطرب ذہنوں کی تسلی کا سامان ہو۔

یہ ترجمانی دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، دونوں منظر عام پر ہیں لیکن میرے سامنے صرف پہلی جلد ہے، ابتدا میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا گرانقدر و مفصل پیش لفظ ہے جسمیں اس کی خصوصیات کا اعتراف کیا گیا ہے اور تاریخ تراجم قرآن کو سامنے رکھ کر مولانا کی اس ترجمانی کی اہمیت وفوقیت کی طرف اشارے بھی کیے گئے ہیں، پھر مصنف نے ''ترجمۂ قرآن اور میری کہانی'' کے عنوان کے تحت اپنے تدبر قرآن کے سفر کی دلچسپ داستان رقم کی ہے، جو یقیناً ذوق مطالعہ اور تدبر قرآن کے لئے مہمیز کرنے کے ساتھ ان کے قرآن سے تعلق اور وسعت مطالعہ نیز ان پر خاص رحمت الٰہی کا پتہ دیتی ہے، اس کے بعد مولانا نے ''کچھ مباحث قرآنی کے بارے میں'' کا عنوان قائم کیا ہے اور تراجم کی مشکلات اور محدودیت نیز تفاسیر کے گنجلک اور غیر واضح مقامات کے متعلق فاضلانہ اور جرأتمندانہ بحث کی ہے، جس کی بنیاد علوم القرآن کی کتب پر نہیں بلکہ خود قرآن کریم میں غور و تدبر پر ہے ایک اقتباس پڑھیے اور مولانا کے فکری افق اور جرأتمندانہ موقف کا اندازہ کیجئے۔

''اعجازِ قرآنی کا اولین مظہر، اس کی زبان، اس کا اندازِ بیان، اس کی حیرت انگیز تاثیر، اور اس کی بے نظیر فصاحت و بلاغت تھی، یہ پہلو خاص طور پر اس کے عرب مخاطبِ اولین کے لیے تھا جن کو سب سے زیادہ ناز اپنی زبان اور اپنے بیان پر تھا، ہر پیغمبر وقت کے چیلنج کا جواب دیتا ہے، اور خود اپنے دور کے لئے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔

اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا، ایک حد تک ترجمانی ہوسکتی ہے، ترجمہ مطابقِ اصل ہوتا ہے، اور قرآن کے معاملے میں یہ ناممکن ہے۔

جو حضرات حرفی ترجمہ، یا تحت اللفظ ترجمے کا اہتمام کرتے رہے، وہ قرآنی الفاظ کی ڈکشنری تیار کرتے رہے، کہ ہر لفظ کے نیچے اپنی زبان کا ایک لفظ رکھ دیا، اور وہ بھی اس کا

ترجمہ نہیں ہے، کیوں کہ قرآن کے ایک ایک لفظ کے متعدد اور وسیع معانی ہوتے ہیں، دوسری زبان کے ایک لفظ سے اس کا جامع اور وسیع مفہوم ادا نہیں ہوتا، قرآن کے مخاطبین الفاظ کے جن معانی کا ادراک رکھتے تھے، اور اس کا ان پر جو اثر مرتب ہوتا تھا، وہ اس ترجمے سے بالکل ادا نہیں ہوتا، جو دوسری زبان کی تنگ دامانی کی وجہ سے پیش آتا ہے۔

جہاں تک ''تحت اللفظ'' پورے جملے کے ترجمے کی بات ہے، تو سچی بات یہ ہے کہ وہ تو عربی ترکیب کا بے جوڑ سا اظہار ہے، جس سے قاری کو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں جملے کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے، لیکن اس سے جملے کے مفہوم کو صحیح طور پر دوسری زبان میں ہرگز ادا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان مترجَم جملوں کا پڑھنے والا (ڈر یہ ہے کہ) الٹا تاثر لے سکتا ہے، کہاں قرآن کے بیانات کا اٹھان اور ان کی سج دھج اور طمطراق، اور کہاں وہ بے ترتیب سے جملے جو نہ اصل متن کی ترجمانی کرتے ہیں، نہ ترجمے کی زبان کی ترکیب ملحوظ رکھتے ہیں۔

اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ جتنا زیادہ ''رعایتِ لفظی'' ''حرفی ترجمہ'' اور ''تحت اللفظ ترجمہ'' کا خیال رکھا جائے گا، ترجمہ اتنا ہی کمزور ہوگا، اور مقصد سے دور ہوگا۔

مسئلہ جو کچھ ہے وہ ترجمانی کا ہے، یعنی قرآنی مضامین کی توضیح وتعبیر کا ہے، جو قرآن میں دور جاہلی کے اسلوب میں کی گئی ہے، عرب اولین کے مزاج اور انداز اور اسلوب کی رعایت کے ساتھ کی گئی ہے، اسے آپ اپنے مخاطبین تک پہنچانے میں کیسے کامیاب ہوں گے؟ یہ سوال ہے۔ جس کا جواب مطلوب ہے.....''

''.....اور کیوں کہ ہدایت و رہنمائی کے باب میں قرآن: ''تبیانا لکل شئ'' ہے۔ (ہر چیز خوب کھول کر بیان کرتا ہے)

اس لیے ترجمہ، ترجمانی، یا لسان القوم میں بیانِ قرآنی کچھ بھی کہیے، اس کا طریقہ بھی ہمیں قرآن سے سیکھنا چاہیے۔

قرآن نے سابقہ کتابوں کے مضامین جا بجا پیش کیے ہیں، جو کتابیں سریانی، عبرانی اور دیگر زبانوں میں تھیں، قرآن نے ان کے اقتباسات پیش کرنے میں جو اسلوب ملحوظ رکھا ہے اس کو ترجمانی کے نمونے کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے، اگرچہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ ان آسمانی کتابوں میں موجود ہے، وہی اصل متن ہے جس کا ترجمہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی قرآن کیوں کہ ان کا عام طور پر مصدق ہے، سوائے ان مضامین کے جن میں تحریفات کا اظہار قرآن میں کر دیا گیا ہے، اس لیے تقابل بہر حال ممکن ہے۔''

اس کے بعد ایک بحث مولانا نے ''قرآن کی کہانی قرآن کی زبانی'' کے عنوان سے کی ہے، جو از خود فاضلانہ، عالمانہ اور اس سے بڑھ کر قرآن کی روح، اس کے آسان ہونے کا مطلب سمجھنے اور اس کے موضوعات و مطالبات کو رگ و پے میں سرایت کرنے میں بڑی معاون و مؤثر ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کاوش کو قبول عام عطا کرے اور تمام طالبان علوم القرآن کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

عنقارا بلند است آشیانہ

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد نانوتویؒ ایک دن مسجد چھتہ دیوبند میں طلباء کو درس دے رہے تھے اسی دوران ایک نواب صاحب آئے اور ملاقات کے بعد دعا کی درخواست کی، نواب صاحب جب رخصت ہونے لگے تو نانوتویؒ کی خدمت میں اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی پیش کی اور کہا: یہ آپ کی ضرورت کے لئے ہیں'' حضرت نے فرمایا: ''مجھے ضرورت نہیں'' نواب صاحب نے کہا ''کسی کار خیر میں خرچ کر دیجئے'' فرمایا ''مجھے کیوں وکیل بناتے ہو، نیکی کا کام ہے خود کرو'' اور لطیفہ بھی فرمایا کہ ''دیکھو! اگر مجھ میں انفاق (خرچ کرنا) کی اہلیت ہوتی تو خدا مجھے دے دیتا، جب خدانے تمہیں دیا ہے تو اب وسائط (ذریعہ) کیوں ڈھونڈتے ہو، جاؤ اپنی مرضی سے خرچ کردو''

الغرض حضرت نانوتویؒ نے تھیلی کو قبول نہ فرمایا۔ نواب صاحب جب جانے لگے تو مسجد سے باہر جہاں حضرت کی جوتیاں تھیں، تھیلی کو اس میں بھر دیا اور چلے گئے۔ حضرت درس سے فارغ ہوکر جب جوتے پہننے لگے تو اس میں اشرفیاں بھری تھیں، طلباء کو بلایا اور فرمایا:

''دنیا ایسی خبیث چیز ہے کہ تم پیچھے بھاگو تو یہ دور بھاگتی ہے اور جب تم اس سے دور بھاگو تو وہ قدموں میں اور جوتوں میں آتی ہے، اس کا حال بھی فاحشہ عورت کا حال ہے، کوئی اس کے قریب جائے تو دور بھاگے، دور جائے تو قریب آئے''

(چراغِ راہ صفحہ ۲۰۲ مولانا رضوان القاسمیؒ)

اس واقعہ کو غور سے پڑھ کر ہم سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے کہ آج ہم دنیا اور اسباب دنیا کی محبت میں کس قدر گرفتار ہیں۔ عوام تو کالأنعام ہیں طبقۂ خواص بھی اس مرض میں بری طرح گرفتار ہیں، اس طبقہ کا بھی مطمح نظر عام طور پر دنیا اور اس کی ٹیپ ٹاپ ہے، یہ طبقہ بھی جنہیں دنیا اور دنیا کے ساز وسامان کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے تھا بل توثرون الحیٰوۃ الدنیا (بل کہ تم لوگ دنیاوی زندگی اور ساز وسامان کو ترجیح دیتے ہو) کے مخاطب نظر آرہے ہیں اس کے برخلاف اگر ہم دنیا سے بھاگے تو یہ دنیا اور درہم و دینار ہمارے پیروں کی ٹھوکروں میں ہوتے اور یہ دنیا ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتی، ہماری باتوں، نصیحتوں وعظوں اور دعوتوں میں تاثیر ہوتی اور دنیا کے پرستاروں سے صاف صاف کہہ دیتے۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام سنجر و طغرل نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

☆☆☆

(م،ق،ن)